مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا جائزہ: میشل دی مانتین (M.D. Montigne) کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار

عابد حسین ہاشمی

رجسٹریشن نمبر: 167-FLL/MSURDU/F15

نگران

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

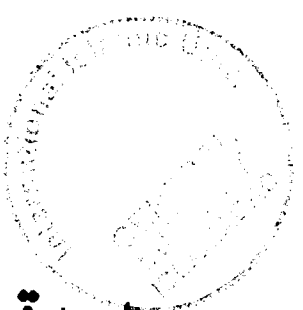

شعبۂ اُردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No [illegible]

MS
891.4394
ہ ام

اردوادب - مضامین
" - انشائیے

مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا جائزہ-مانتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

عابد حسین ہاشمی

رجسٹریشن نمبر:167-FLL/MSURDU/F15

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم فل / پی ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا جائزہ: میشل دی مانتین (M.D. Montigne) کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں**

مقالہ نگار: عابد حسین

رجسٹریشن نمبر: 167-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر نعیم مظہر
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر سائرہ بتول
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

اگست، 2019ء

اقرار نامہ

میں، عابد حسین ہاشمی، رجسٹریشن نمبر:167-FLL/MSURDU/F15 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا جائزہ- مانتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اِسلامی، یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

عابد حسین ہاشمی

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

عابد حسین نے رجسٹریشن:167-FLL/MSURDU/F15 کے تحت اپنا تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا جائزہ: میشل دی ماٹین (M.D. Montigne) کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

کمیٹی دفاع مقالہ منعقدہ اجلاس مورخہ ۲۱/اگست ۲۰۱۹ء میں جو تجاویز دیں اس کے مطابق مقالہ نگار نے درستی کر لی ہے۔ اب یہ مقالہ شعبہ امتحانات کو بھیجنے اور ڈگری جاری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

سپروائزر/اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

انتساب

والدِ گرامی صوفی باصفا، عالمِ باعمل مخدوم خادم حسین ہاشمی چشتیؒ اور والدہ محترمہ مزمل خاتوں الملقب بہ بی بی جیؒ کے

نام، جن کی تربیت اور فیضانِ نظر سے میری زندگی کا ہر گوشہ منور ہے

فہرست عنوانات

پیش لفظ

باب اول: انشائیہ اور مشیل دی مانتین کا تصورِ انشائیہ: بنیادی مباحث

باب دوم: اردو انشائیے کی روایت اور معاصر اردو انشائیہ نگار

باب سوم: مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ

باب چہارم: مونتین، مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ

باب پنجم: مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا تقابلی جائزہ

ماحصل

کتابیات

پیش لفظ

میں گذشتہ تینتیس برس سے شعبہ تدریس سے منسلک ہوں اور مختلف علوم وفنون بالخصوص اردو ادب کا طالب علم ہوں۔ زندگی کی پچاس بہاریں اور پچاس خزائیں دیکھنے کے بعد میرے دل میں اپنے مطالعے کو جانچنے کے شوق نے انگڑائی لی۔ چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لیے میں نے اکاون سال کی عمر میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ایم ایس اردو پروگرام میں داخلہ لیا۔ کلاس ورک مکمل ہونے کے بعد انتخابِ موضوع کی باری آئی تو میری نظرِ انتخاب اردو ادب کی ایک صنف "انشائیہ" پر پڑی جس کی بڑی وجہ اردو ادب کے بیشتر ناقدین کی طرف سے اس زندہ صنف کو موت کی وادی میں دھکیلنے کی تعجب خیز اور ناقابلِ ستائش سرگرمیاں تھیں۔ معدودے چند رسائل کے علاوہ اس صنف کا نام بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ دورانِ تحقیق یہ انکشاف ہوا کہ یہ ساری منصوبہ بندی انشائیہ کی صنفِ ادب کی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے کی گئی جس کی واحد وجہ انشائیہ کے بارے میں قائم کیے گئے نظریات میں اختلاف اور دبستانِ سرگودھا کی مخالفت ہے۔ حالانکہ وزیر آغا سمیت دبستانِ سرگودھا کا کوئی ایسا نقاد نہیں جو وزیر آغا سے پہلے انشائیہ کے وجود کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اگرچہ انشائیہ کے بارے میں نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے تصورات اپنی جگہ معتبر اور موقر ہیں مگر باقاعدہ ایک تحریک چلا کر انشائیے کو شعوری طور پر ایک صنف کی حیثیت سے منوانے کا سہرا ڈاکٹر وزیر آغا کے سوا اور کسی کے سر نہیں سجتا۔ دبستانِ سرگودھا میں وزیر آغا کے بعد جن دو ادبا نے گلزارِ انشائیہ کی آبیاری کی ان کے اسمائے گرامی پروفیسر مشتاق قمر اور پروفیسر جمیل آذر ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیہ کے بعد انہی دونوں کے انشائیے پہلی مرتبہ ماہنامہ اوراق کی زینت بنے۔ چنانچہ انشائیہ پر تحقیق کے ساتھ ساتھ بانی انشائیہ مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی اور اس تصور کی روشنی میں ان دونوں انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں نہ صرف میں نے انشائیہ کے ان مباحث کو نئے سرے سے دیکھا ہے بلکہ مندرجہ ذیل عنوانات پر پہلی بار تحقیق کی ہے:

1۔ علمِ نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں انشائیہ کا مقام 2۔ انشائیہ ایک تخلیقی صنف 3۔ انشائیہ اور غزل میں حیرت انگیز مماثلت 4۔ انشاء نگاری، انشاپردازی، انشائے لطیف اور انشائیہ نگاری میں فرق اس مقالے کو میں

نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب کے پہلے جزو میں انشائیے کا تعارف، اس کی اہمیت و افادیت اور اس کی پہچان کرائی گئی ہے۔ پھر ادبِ مشرق و مغرب میں انشائیے کی گئی تعریفوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے جزو میں دس بنیادی مباحث (1۔انشائیہ بطور تخلیقی صنف 2۔انشائیہ کی شناخت 3۔اردو انشائیہ نگاری اور اردو انشاء نگاری کا تقابل 4۔اردو انشائیہ نگاری اور اردو انشاپردازی کا تقابل 5۔اردو انشائیہ اور اردو انشائے لطیف کا تقابل 6۔علمِ نفسیات کی روشنی میں انشائیہ کا جائزہ ۔7۔انشائیہ اور مضمون میں فرق۔8۔انشائیہ اور طنز و مزاح 9۔ انشائیہ اور غزل میں حیرت انگیز مماثلت 10۔ اردو انشائیہ کا بانی) شامل ہیں ۔ تیسرے جزو میں مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ سے متعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو انشائیے کی روایت کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے نیز مشتاق قمر اور جمیل آذر کے معاصر اردو انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے فنی و موضوعاتی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مانتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ لیا گیا۔ چوتھے باب میں مانتین، مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے اور آخری باب میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا پہلے مانتین کے انشائیوں سے تقابل کیا گیا پھر دونوں کا باہمی تقابل پیش کیا گیا ہے۔

میں اپنے اساتذہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر ارشد معراج اور ڈاکٹر روش ندیم کا تہہ دل سے ممنون ہوں جن میں سے ہر ایک نے اپنی جوئے علم سے مجھے سیراب ہونے کا پورا موقع فراہم کیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی جیسی شخصیت کی نگرانی میں مقالہ لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مجھے آپ جیسی شخصیت کی شفقت اور رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو میں یہ مقالہ کبھی مکمل نہ کر پاتا۔

میں اپنے کرم فرما اور محسن ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر محمد وسیم انجم چیئرمین شعبہ اردو وفاقی اردو یونیورسٹی برائے آرٹس، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اسلام آباد کا صمیمِ قلب سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر مقالہ ہذا کے لیے مواد کی فراہمی میں ہر طرح سے مدد فرمائی۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر زاہد محمود چغتائی، سردار محمد وسیم الحق خان (شعبہ لائبریری، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) اور اپنے

ادارے گورنمنٹ ہائی سکول ہنیسر تحصیل کہوٹہ (جہاں میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہاہوں) کے ہیڈماسٹر راجامحمد جمیل وجملہ سٹاف کا بھی شکریہ اداکرتاہوں جنہوں نے اس مساعی میں میرا حوصلہ بڑھایا۔

آخر میں اپنی اہلیہ وحیدہ کوثر کاتذکرہ نہ کرنانا انصافی ہوگی جس نے ہر مشکل گھڑی میں میری ہمت افزائی کی اور میرے حصے کی گھریلوذمہ داریوں کو بھی اکیلے سرانجام دیا۔اس کے ساتھ ساتھ اپنے اکلوتے بیٹے محمد عبداللہ علی ،بھانجے فہیم احمد، بیٹی رقیہ بتول اور بھتیجوں ثنا، حنا، قرۃ العین، جویریہ، عائشہ، بشریٰ اور بھتیجوں عبیدالرحمان، سیف الرحمان اور محمد ذوالقرنین حیدر کی معاونت پر انہیں بھی داد دیتاہوں۔

عابد حسین ہاشمی

مقالہ نگار

باب اول

انشائیہ اور مشیل دی مانتین کا تصورِ انشائیہ: بنیادی مباحث

اردو انشائیہ غیر افسانوی اردو نثر کی ایک صنف ہے۔اسے فرانسیسی زبان میں ایسائی اور انگریزی زبان میں لائٹ پرسنل ایسے کہا جاتا ہے۔اس صنفِ ادب کا موجد فرانسیسی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والا دانشور، فلسفی اور ادیب مشیل دی مانتین ہے۔یہ تحریریں اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کنجِ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اعزہ و اقارب کی دلچسپی کے لیے لکھی تھیں۔بعد ازاں اس نے انہیں "ایسائی" کے نام سے شائع بھی کر دیا۔مانتین کے ان ایسائیوں کو جان فلوریو نامی انگریز ادیب نے انگریزی میں ترجمہ کیا جس سے متاثر ہو کر مانتین کے ہم عصر انگریزی فلسفی اور مفکر فرانسس بیکن نے بھی لکھنا شروع کیا۔بیکن کی یہ تحریریں کسی حد تک ہلکی پھلکی تو تھیں لیکن انشائیہ یا ایسے کی طرح ذاتی و داخلی کے بجائے خارجی و فلسفیانہ تھیں۔اس لیے اس نے انہیں ایسائی کے بجائے ایسے کا نام دیا۔اردو میں ایسے کا ترجمہ مضمون ہے جب کہ ایسائی کا ترجمہ انشائیہ ہے انگریزی میں انشائیے کا مترادف پرسنل لائٹ ایسے ہے۔چونکہ اردو میں اس صنفِ سخن پر سب سے کم توجہ دیگئی اس لیے راقم نے اسی صنف کو موضوعِ تحقیق کے طور پر چنا۔

کسی چیز کو موضوعِ تحقیق بنانے سے پہلے یہ دیکھنا نہایت اہم ہے کہ اس چیز کی اہمیت اور افادیت کیا ہے۔انشائیہ اردو ادب کی ایسی صنف ہے جو اپنے وجود میں آنے کے ساتھ ہی متنازعہ بنا دی گئی یہاں تک کہ ناقدینِ ادب نے کبھی اسے سنجیدہ مضمون کا نام دیا کبھی طنز و مزاح کا ایک اسلوب قرار دیا، کبھی انشاء نگاری سے موسوم کیا تو کبھی انشاپردازی گردانا۔ کبھی اسے صفت قرار دیا تو کبھی صنف۔پس انشائیے کے بنیادی مباحث اور مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ کا تحقیقی جائزہ لینے سے قبل انشائیہ کا تعارف اور اس کی اہمیت، افادیت اور شناخت کو بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔

الف: انشائیہ کا تعارف و اہمیت

انشائیہ اردو ادب کی ایک نثری صنف ہے۔اس کا مضمون، مقالے، طنزیہ اور مزاحیہ سے کوئی تعلق نہیں۔انشائیہ معمولی سے معمولی بات یا موضوع پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔انشائیہ میں کسی بات یا چیز کو موضوع

بنا کر انشائیہ نگار غیر رسمی طور پر بے ربط انداز میں کفایتِ لفظی کے ساتھ دلکش، تازہ، لطیف، سادہ، شگفتہ اور فرحت بخش اسلوب میں اپنے تجربات اور تجزیات میں اپنی ذات کو شامل کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری اس بات، مظہر یا چیز کے نئے، انوکھے اور اچھوتے رخ سے آشنا ہوتا ہے اور وہ ایک نئی مسرت اور بہجت محسوس کرتا ہے۔ انشائیے میں عدم تکمیل قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ انشائیے میں تمہید، ابتدا اور اختتام نہیں ہوتا نہ ماحصل کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں قاری نہ اکتاتا ہے نہ اسکی طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے نہ اس میں ہیجان بیدار ہوتا ہے نہ اسے بالواسطہ نصیحت کی جاتی ہے اور نہ اس میں فلسفہ اور منطق کے خشک مباحث چھڑتے ہیں اور نہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا ہے۔

انشائیہ منطقی یا استدلالی تحریر نہیں بلکہ تخلیق کار کے معاشرے اور اس کی اپنی زندگی کے تعلق سے ذاتی تجزیوں کا ایک اظہار ہے۔ یہ اظہار سادہ اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس میں حکمت و فلسفہ بھی بیان ہوتا ہے مگر لطیف انداز میں۔ اچھا انشائیہ روح کو تازگی، دل کو انبساط اور ذہن کو مسرت فراہم کرتا ہے۔ انشائیہ اسی خصوصیت سے پہچانا جاتا ہے۔ انشائیہ کا کمال کسی بلیغ بات کو جامع اور مختصر شکل میں پیش کرنا ہے جس میں شگفتگی اور تازہ کاری کا عمل جاگزیں ہوتا ہے۔

انشائیہ کی اہمیت اس لیے بھی روشن ہے کہ نثری اظہار کی یہی وہ صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار، شخصی رد عمل، عدم تکمیل، اختصار، رمزیت و اشاریت، غیر منطقی ربط، کفایتِ لفظی، دعوتِ فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، زبان و بیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پیدا کر کے مسائل کا حل، زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لینے کی صلاحیت، غمگیں دلوں کی شگفتگی کا سامان اور خشک خیالات کے گہری اور گھٹاٹوپ تاریکی میں جگنوؤں کی سی سبز روشنی کی مشعل، سطحیت پر سے دعوتِ فکر کے گہرے سمندر کی ڈبکیاں انشائیہ نگار اور قاری کے درمیان رابطے کے پل (Bridge) کا کام کرتی ہیں۔ معتدل طنز و مزاح قارئین کے دل کو تیر کے بجائے پھول بن کر لگتا ہے۔ کسی تکلیف یا درد کے بغیر دل و ذہن کی جراحی انشائیے ہی کا کارنامہ ہے۔

اردو کی سب سے کم عمر اور کم سرمائے کی حامل اس صنفِ ادب پر سب سے زیادہ بحث و تمحیص ہوئی اور درجن بھر تنقیدی کتب اور کثیر تعداد میں تنقیدی مضامین اور مقالے لکھے گئے۔ کئی ادبی رسائل نے انشائیہ نمبر نکالے اور متعدد جامعات اور اداروں نے تنقیدی مجالس منعقد کیں نیز بہت سارے ادباء نے انشائیے لکھے اور لکھ رہے ہیں۔

انشائیہ نگار کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ وہ سماج کا دوست ہوتا ہے۔ وہ قاری کو نہ تو کسی قسم کے ہیجان میں مبتلا کرتا ہے، نہ اس کے دل کی دھڑکنوں کو مرتعش کرتا ہے اور نہ اس کے لہو میں بلند یا پست فشار ہی لاتا ہے، بلکہ اسے ہلکی ہلکی مسرت اور ہلکا ہلکا تبسم فراہم کرتا ہے۔ انشائیہ وہ واحد صنفِ ادب ہے جس میں دیگر تمام اصناف کے مقابلے میں آزادیِ اظہار کے کہیں زیادہ مواقع میسر ہیں۔ اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انشائیہ وہیں پھلتا پھولتا ہے جہاں اظہارِ رائے پر، مذہبی، نظریاتی، معاشرتی، سیاسی یا سماجی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کی برصغیر میں بھی آزادی کے بعد ہی اس صنف کو ترقی نصیب ہوئی۔ ادب کی افادیت کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک یہ کہ اس سے قاری پر بہجت و مسرت کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے وہ لذت و سرور کشید کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی اپنی زندگی اور سماج کے دیگر افراد کی زندگی اور ماحول کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اس تخلیق یا فن پارے سے معاشرے کی اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی، فکری، مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ انہی پہلوؤں پر کیے جانے والے مباحث نے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے نظریات قائم کیے جنہوں نے ادب کو میدانِ جنگ بنا دیا اور ادب میں ایک دوسرے کے محاسن بھی عیوب شمار کیے جانے لگے۔ حالانکہ ادب کسی بھی قسم کا ہو اس کے اثرات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور کرتے ہیں داخلیت وہ یا خارجیت دونوں کا وجود ناگزیر ہے، قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے ''سنریھم اٰیٰتنا فی الانفس والآفاق'' [ترجمہ: ہم عنقریب انہیں ان کے داخل میں اور ان کے خارج میں اپنی نشانیاں دکھادیں گے][1] یہاں 'داخل' سے مراد انسان کے باطن کی دنیا ہے جس میں اس کی جسمانی ساخت کے عجائبات، اس کے دماغ کی دنیا، اس کے وجدان کی دنیا اور اس کی روح کی دنیا جب کہ 'خارج' سے مراد اس کی معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی زندگی ہے۔ اگر ہم اس آیتِ قرآنی کو زیادہ وسیع معنوں میں دیکھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ داخلیت اور خارجیت دونوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ نیز "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کے دونوں نظریات ایک انسان کے لیے ضروری ہیں کیونکہ ادب کو انسان کے لیے

لذت کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ عمل کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔اس لیے ان دونوں نظریات کا اعتدال کی سطح پر امتزاج ہی ادب کی معراج ہے۔

انشائیہ ادب کے مندرجہ بالا دونوں نظریات کا امتزاج ہے۔انشائیہ جہاں قاری کو داخلی حظ اور مسرت فراہم کرتا ہے وہاں وہ معاشرے اور زندگی کے بارے میں قاری کی فکر کو بھی متاثر کرتا ہے۔اور سوچ کی تبدیلی کی راہ پر بھی گامزن کرتا ہے۔انشائیہ کوئی منطقی تحریر نہیں ہوتی بلکہ تخلیق کار کے ذاتی تجربات اور محسوسات جن کا تعلق معاشرے اور سماج سے جڑا ہوتا ہے، کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ان تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لیے ایسا اسلوب منتخب کیا جاتا ہے جو نہ تحقیقی اور دلائل و براہین سے موضوع کے اثبات پر زور دینے والا یعنی تحقیقی ہو اور نہ طنز و مزاح پر مبنی ''پنچ'' ہو۔اچھا انشائیہ روح کو بہجت اور نفس کو مسرت عطا کرتا ہے۔یہی انشائیے کی افادیت ہے۔ انشائیہ فصیح و بلیغ بات کو مختصر، سادہ اور کم الفاظ میں ایسے شگفتہ اور تازہ حالت میں پہنچاتا ہے کہ قاری کو ایک گونہ انبساط اور کیف حاصل ہوتا ہے۔

انشائیہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی شعور کا آئینہ ہوتا ہے۔انشائیہ میں کسی بھی معمولی سے معمولی چیز یا مظہر کو ایک نئے زاویے کے ساتھ غیر معمولی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔انشائیہ آزاد فضاؤں میں لا کر قاری کو قواعد و ضوابط اور رسم و رواج کی بند حویلی کے گھٹن زدہ ماحول سے آزادی دلاتا ہے۔یوں تو اردو میں انشائیے کی عمر بہت کم ہے بلکہ صنفِ ادب کی حیثیت سے تو یہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں سامنے آیا۔اس دہائی میں انشائیے کو مضمون، انشاء نگاری، انشاء پردازی، ادبِ لطیف، مضمون اور طنز و مزاح سے الگ ایک منفرد صنفِ ادب کے طور پر پہچان لیا گیا۔

یوں تو ایسی کئی صفات اور خصوصیات ہیں جو مختلف اصناف میں مشترک ہوتی ہیں مثلاً کہانی افسانے میں بھی ہوتی ہے اور ناول ،ڈرامے، داستان، شاعری (بالخصوص مثنوی اور نظم وغیرہ میں) میں بھی، اس کے باوجود افسانہ، ڈرامہ، ناول، کہانی، داستان، اور شاعری وغیرہ الگ الگ اصنافِ ہیں۔بعینہ انشائیہ اکثر اصنافِ ادب سے مشابہ بھی ہے اور مختلف بھی۔اس میں ادبِ لطیف کی چاشنی ضرور ہے مگر یہ ادبِ لطیف نہیں۔ ہیئت و شکل میں یہ سب سے زیادہ مضمون سے مشابہ ہوتا ہے لیکن یہ مضمون سے بالکل الگ چیز ہے۔اس میں ناول یا افسانے کی سی دلچسپی تو ہوتی ہے مگر یہ ناول، کہانی اور افسانے سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔اس میں طنز و مزاح کا تڑکا تو ہوتا ہے مگر یہ

طنزیہ ومزاحیہ مضامین سے بالکل الگ چیز ہوتی ہے۔ غیر رسمی طریق کار، انکشافِ ذات، عدم تکمیل، بے ربطی اور تازہ کاری وہ خصوصیات ہیں جو انشائیہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔

جہاں تک انشائیہ کی تعریف کا تعلق ہے تو ادب کی باقی اصناف کی طرح اس کی بھی جامع ومانع تعریف اب تک نہیں کی جا سکی پھر بھی معروف انگریزی اور اردو ماہرینِ ادب کی کچھ تعریفیں تنقیدی جائزے کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں

آلڈس ہکسلے لکھتا ہے:

"The essay is a literary device for saying almost everything about almost anything"[2]

ترجمہ: ایسے تقریباً ہر طرح کی چیز کے بارے میں ہر طرح کی بات کہنے کا وسیلہ ہے۔ (مترجم راقم)

ہکسلے ایسے سے مراد انشائیہ لیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ تعریف انشائیے کی جزوی تعریف ہے جس میں انکشافِ ذات، عدم تکمیل، سبک اسلوب اور دعوتِ فکر جیسی اہم خصوصیات کا ذکر نہیں ہے۔

جارج سینٹ بری کے نزدیک ایسے ایک ایسی بات چیت ہے جو کوئی دلچسپ اور ہر طرح کی معلومات رکھنے والا شخص رات کے کھانے کے بعد کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> After dinner monologue of an interesting and well informed man.[3]

جارج سینٹ بری کے نزدیک بھی ایسے سے مراد انشائیہ ہی ہے جو گپ شپ میں کی گئی بے ربط گفتگو کو قلمبند کرنا ہے۔ ہکسلے کی طرح یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔

ڈبلیوایم ولیم کے مطابق:

ایسے ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے تاہم انشائیہ نگار نکتہ آفرینی کے لیے کسی چھوٹے سے واقعے کو بھی استعمال کر سکتا ہے اور اپنے زاویۂ خیال کی تمثیلی وضاحت کے لیے ناول سے ایک ورق لے کر اس سے کردار بھی تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ انشائیہ نگار کا بڑا مقصد کہانی یا واقعہ کی پیشکش نہیں بلکہ انشائیہ نگار معاشرے کا فلسفی، ناقد اور حاشیہ نگار ہے:"[4]

یعنی ڈبلیو۔ایم۔ ولیم کے مطابق انشائیہ نگار کا بنیادی کام نکتہ آفرینی ہے اور اس کے لیے وہ کوئی بھی وسیلہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ فلسفیانہ توجیہ، معاشرتی مظاہر پر تنقید اور حقائق کے انکشاف کی مدد سے اظہار کی وسعتوں کو تلاش کرتا ہے۔

ایف ایچ پریچرڈ کا قول ہے :

"دوسری اصناف کے مقابلے میں ایسے متوازن فکر کا عمدہ حاصل ہے۔اس میں ہلکا سا اضطراب وبے چینی اور نا موجود کو موجود سے دریافت کرنے کی آرزو ملتی ہے۔ ایسّے کی سعی پارہ پارہ اور مختصر ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ خلوص سے معمور ہوتی ہے۔اور موضوع کو ذات کے حوالے سے پیش کرتی ہے۔"[5]

ناموجود کو موجود سے دریافت کرنا تخلیق ہے۔ کسی بھی صنف کی ادبی حیثیت اس صفت کے بغیر یقینی نہیں ہے۔انشائیہ کی کوئی تخصیص نہیں البتہ متوازن فکر اور موضوع کو ذات کے حوالے سے پیش کرنے کا عمل انشائیہ کی انفرادی خصوصیت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔

ہاؤسٹن پیٹرسن کہتے ہیں:

"ایسے کا مطلب تحریر کا ایک چھوٹا ٹکڑا ہوگا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں۔ایسّے مفکرانہ ہوگا مگر سنجیدہ نہیں، وہ فلسفے سے قریب تر ہوگا مگر لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں۔اس اور لفظوں کا فن کار ہوگا۔"[6]

اس تعریف کی رو سے انشائیہ شخصی نقطہ نظر کا اظہار ہے ۔ اسی لیے گھسے پٹے انداز، چبے چبائے الفاظ، مخصوص فکری سانچوں میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہوگی۔اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش

انحراف بھی ہو گا۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن اتفاق رائے پر مجبور نہیں کرے گا۔ انشائیہ نگار چاہے اور جو کچھ بھی ہو، وہ ہمارا دوست سے گریز، موضوع سے منحرف ہو کر اس کے اچھوتے پہلو بے نقاب کرنا انشائیہ نگار کا طریق کار ہے۔ انشائیے کی سب سے مشہور تعریف جانسن کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

" An Essay is a sally of mind,an irregular indigested piece not regular and orderly compositiom" [7]

یعنی انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ اور بے قاعدہ اور غیر منظم عمل ہے۔ جانسن نے انشائیہ کو بے قاعدہ اور غیر منظم عمل قرار دے کر نہ صرف انشائیہ کی ہیئت بلکہ صنفِ انشائیہ اور مضمون کے فرق کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ جانسن کی اس تعریف پر اعتراض ہوا کہ آزاد ترنگ سے مراد تو خبط اور پاگل پن ہے۔ تو کیا ایک انشائیہ نگار پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا ہے؟ تو اس کا جواب دیا گیا کہ پاگل شخص کی سوچ مرکزیت سے بے نیاز ہوتی ہے جبکہ ابشائیہ نگار مرکز سے جڑا رہتا ہے جس طرح ایک جانور جو ایک لمبی رسی کے ساتھ کھونٹے سے بندھا ہوتا ہے وہ جدھر جائے، جو چیز چاہے کھائے، کھونٹے سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یا ایک آدمی جدھر مرضی گھومے پھرے شام کو واپس گھر ہی آتا ہے۔

اردو ادب میں انشائیہ کا لفظ مضمون کے معنی میں پہلی بار ڈاکٹر اختر اورینوی نے سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کے مجموعے "ترنگ" کے دیباچے میں استعمال کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اردو ادب میں انشائیوں اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔ کبھی کبھار کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا تو دو گھڑی کے لیے جی بہل جاتا۔ انشائیہ نگاری مضمون نویسی کی ایک خاص صنف ہے۔۔۔ دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ فلسفہ ایسا ہوتا ہے جس میں خشونت، دل جلا پن یا وحشت خیز سنجیدگی نہیں ہوتی۔ بغیر رندھے ہوئے چہرے کی رنگینی ہوتی ہے، مگر ذمہ داری کے ساتھ۔ رندی اور احتساب کا مجموعہ مضحکہ خیز نہیں ہوتا بلکہ امتزاجِ کامل کے نتیجے میں ایک بڑی دلنواز شخصیت پیدا کرتا ہے۔ ایک ایسی صوفیت جس میں مزاح کا نمک ملا دیا جائے۔ [8]

مولانا عبالماجد دریابادی فرماتے ہیں :

"انشائیہ کے امتیازی خصوصیت حسنِ انشا ہے۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں مغز و مضمون کی اصل توجہ حسنِ عبارت پر ہو۔"[9]

مولانا عبد الماجد دریابادی در حقیقت اس انشاپردازی کی تعریف کر رہے ہیں جس کا رواج اردو میں فارسی سے آیا تھا۔ جس کی عمارت عبارت آرائی اور حسنِ بیاں کے ستونوں پر قائم ہے۔ اردو انشائیہ اردو نثر کی ایک صنف ہے جب کہ انشاپردازی ایک صفت کا نام ہے۔ البتہ انشاپردازی کی مندرجہ بالا صفات انشائیہ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ کلیم الدین احمد جو مغربی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، انشائیہ کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

انشائیہ کوئی نئی صنف نہیں، یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں "ایسے" کہتے ہیں۔ خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے سرچشموں کو پالیتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں۔ یہ ان میل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے۔ اس طرح وہ ان سے نجات پالیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے۔ کیونکہ دانشمند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔[10]

کلیم الدین احمد کا مشیل دی مانتین کی گفتگو کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے باوجود، جو اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ایسیز" (ESSAIS) کے پیش لفظ میں انشائیہ کی تعریف میں کی ہے، انشائیہ کو مضمون ہی کی صنف قرار دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر آدم شیخ انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انشائیے ایک ذہین، رنگیں مزاج، ترقی پسند اور روایت شکن فن کار کے جذبات اور احساسات کا پرتو ہی ہوتے ہیں۔ ایک انشائیہ میں لکھنے والے کے ان جذبات کا اظہار ہوتا ہے جن کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ انشائیہ مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوسیت اور مطابقت پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اس کے انفرادی نظریات اور اس کی ذہنی کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے۔ ادیب اس اظہار کیلیے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اصنافِ ادب میں بھی جو تحریریں انشائیہ نگار کے لیے معنی خیز خیال کی حامل ہوتی ہیں۔ اپنے مواد، ہیئت اور اندازِ بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں۔[11]

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال ہے:

"انشائیہ ایک ہلکا پھلکا، پر لطف اور شگفتہ مضمون ہوتا ہے جس میں انشائیہ نگار کی حیثیت اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔ انشائیہ فکاہی رنگ میں ڈوب کر بھی ہم سب کے لیے تفریح اور مسرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔"[12]

ڈاکٹر آدم شیخ اور سیدہ جعفر نے بھی مضمون اور انشائیے کو خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں بھی انشائیے کی شناخت ہو چکی ہے اور اسے پرسنل ایسّے کا نام دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

انشائیہ اس صنفِ نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔[13]

گویا ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک اسلوب کی تازہ کاری، اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو گرفت میں لانا، مسرت آفرینی اور انشائیہ کے موضوع کو عام سوچ سے ہٹ کر دکھانا انشائیہ کی لازمی خصوصیات ہیں۔ آگے چل کر وہ انشائیہ کی کچھ اور خصوصیات گنواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

انشائیے کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لمحہ بھر کے لیے آزادی دلوانا ہے تاکہ ہم غیر جانبدارانہ طریقے سے زندگی کے روشن یا تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں واضح رہے کہ انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے اس کے علاوہ کوئی مکمل نقطۂ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے اس کا کام محض اسی طرح یک چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔[14]

مندرجہ بالا اقتباس میں وزیر آغا نے انشائیے کی کچھ خصوصیات کی وضاحت کی اور کچھ مزید خصوصیات کا ذکر کیا جن میں عدم تکمیل کو ایک نمایاں خصوصیت کے طور پر پیش کیا جو انشائیہ اور مضمون کے الگ الگ اصناف ہونے کی بین دلیل ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے انشائیے پر "اردو کا انشائی ادب" کے نام سے جو کتاب لکھی اس میں

انہوں نے تحریروں کا انتخاب کرتے ہوئے خالص انشائیے، انشائے لطیف اور انشاپردازی میں فرق ملحوظِ خاطر نہ رکھا لیکن انشائیے کی تعریف میں ان کے کہے ہوئے یہ الفاظ انشائیے کی جزوی ہی سہی لیکن بہترین تعریف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ذہن کو یکلخت ایک نئی دنیا میں لاڈالنا اس ادب پارہ کا کام ہے۔ اس سے زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اور روز مرہ زندگی کے کئی پامال گوشے نئی معنویت اختیار کرتے ہیں۔ اس میں جو بات بھی کی جاتی ہے اپنی ذات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ یا کم از کم اپنی ذات کو اس میں دخیل ضرور رکھا جاتا ہے۔ انشائی ادب کا اختصار اس کا بنیادی وصف ہے۔[15]

ڈاکٹر سلام سندیلوی انشائیہ کا تعارف کرواتو ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> انشائیہ نگاری مضمون نگاری کا وہ جزو ہے جس میں مصنف اپنی ذات اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے۔ اس پیشکش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔[16]

مندرجہ بالا تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام سندیلوی کچھ انگریز ناقدین کی طرح انشائیے کو مضمون کی ذیلی قسم ہی سمجھتے ہیں جو مانتین کے تصورِ انشائیہ کے مطابق درست نہیں۔ اس کے برعکس معروف طنز نگار نظیر صدیقی اپنے انشائیوں اور مضامین کی کتاب "شہرت کی خاطر" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

> انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہوہ صنفِ ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں۔ اور بامعنی باتوں میں مہملیت اجاگر کی جاتی ہے۔ یعنی Sense میں Non Sense اور Non Sense میں Sense ڈھونڈا جاتا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ یعنی بالفاظِ غالبؔ لکھنے والے کی بے خودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بے خودی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے کس میں کہیں سچ میں جھوٹ اور کہیں جھوٹ میں سچ کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کا نام بھی۔[17]

نظیر صدیقی نے انشائیے کی جو تعریف کی وہ طنزیہ مضمون کی تعریف ہے حالانکہ انشائیہ میں نہ دوسروں کی ہنسی اڑائی جاتی ہے نہ دوسروں کو اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ نہ اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے اور نہ اپنی پگڑی اور دوسروں کا نام۔

درج بالا مباحث کے بعد راقم کا خیال ہے کہ کوئی ایک شخص جس کے ذہن میں ایسے خیالات ہوں یا اسے زندگی میں ایسے ذاتی تجربات حاصل ہوئے ہوں جو نئے بھی ہوں اور انوکھے بھی، وہ انہیں اگر سادہ، تازہ اور شگفتہ ادبی اسلوب میں کفایتِ لفظی اور بے تکلفی کے ساتھ غیر رسمی انداز میں پیش کر دے تو وہ انشائیہ کہلائیں گے۔ البتہ اس تحریر پر طنز و مزاح کا غلبہ اور مقصدیت کی چھاپ نہ ہو۔

ب: انشائیہ کے بنیادی مباحث

1۔ انشائیہ بطور تخلیقی صنف

انشائیے پر کچھ لوگوں کا یہ اعتراض یہ ہے کہ یہ تخلیقی صنف نہیں ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انشائیہ جس لفظ "نشا" سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہی تخلیق کرنا ہے۔ آیئے اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے اس عمل پر نگاہ دوڑائیں جس کا نتیجہ تخلیق ہوتا ہے۔ پس انشائیہ کو تخلیق نہ سمجھنا بڑا ظلم اور متعصبانہ رویہ ہے۔ کسی تخلیق کا ظہور اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک وہ تخلیقی عمل سے نہ گذرے۔ بقول ڈاکٹر محمد خان اشرف:

> تخلیقی عمل چار مراحل میں مکمل ہوتا ہے۔ اول: تخلیقی تجربہ، دوم: تخیل جو اس تجربے کو محفوظ کرتا ہے، سوم: زبان، ہاتھ، آواز یا رنگ جن میں سے کسی ایک کے ذریعے اسے منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ چہارم: قاری، ناظر یا سامع جو دیکھ یا سن کر اس کی باز تخلیق کرتا ہے۔[18]

ایک انشائیہ نگار کی نگاہ جب کسی شے یا مظہر پر پڑتی ہے تو وہ اس کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ اس سے اسے ایک انوکھی قسم کا تخلیقی تجربہ حاصل ہوتا ہے جسے اس کا تخیل محفوظ کر لیتا ہے۔ انشائیہ نگار اس تجربے کو شگفتہ اسلوب میں احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔ اور اس محررہ تخلیق کو "انشائیہ" کہتے ہیں۔

تخلیقی عمل کا سرچشمہ فردِ واحد (تخلیق کار) کی ذات ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ اس کی داخلی واردات میں شریک نہیں ہو سکتے البتہ تخلیق کو منظرِ عام پر لانے کے لیے مدد و مددگار ہو سکتے ہیں۔ جب کہ تخلیق کے کرب سے

صرف تخلیق کار ہی گذرتا ہے۔ گویا تخلیق کار انفرادی طور پر آزاد ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاں انسان کو انفرادی آزادی حاصل نہیں ہوتی تخلیقی عمل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ ادھر انشائیہ نام ہی آزادیِ اظہار کا ہے یہاں تک کہ وہ موضوع کے دائرے سے باہر نکل کر من مانے راستے پر نکل جاتا ہے اور جب مرضی ہوتی ہے واپس آجاتا ہے اور انشائیے میں اظہار کی یہی آزادی اسے تخلیقی صنف کے درجے پر فائز کرتی ہے۔

انشائیہ نگار انشائیہ لکھتے ہوئے داخل کی ایک ایسی گہرائی سے گذرتا ہے جہاں وہ خارجی اور زبردستی طاری کیے ہوئے نظریات کی دست برد سے مکمل طور پر محفوظ و مامون رہتا ہے۔ اس کا تخیل اتنا بلند اور وسیع ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر اہم اور نظر انداز شدہ چیز کے باطن میں جھانک کر اسے غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی طرح انشائیہ نگار بھی گہرے مشاہدے سے کسی چیز کو اچھوتے اور نئے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اگر ایک شاعر کا وہ شعر جو اس نے کسی اور شاعر کی بات کو نقل کرتے ہوئے نئے اسلوب میں بیان کر دیا ہے تخلیق کہلا سکتا ہے (جس کا ارتکاب غالب اور اقبال جیسے نابغوں اور نادرہ روزگار تخلیق کاروں نے بھی کیا ہے) حالانکہ وہ صرف اسلوب کے لحاظ سے ہی نیا ہوتا ہے خیال کے لحاظ سے نہیں ۔تو انشائیہ کیوں تخلیق نہیں کہلا سکتا جو خیال اور اسلوب دونوں لحاظ سے نیا اور انوکھا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ میں پائی جانے والی تلازمہ خیال، نکتہ آفرینی، ایمائیت، اشاریت، تنوع، ژرف نگاہی اور پرکاری کی خوبیاں نہ صرف انشائیے کو تخلیقی اصناف میں شامل کرتی ہیں بلکہ اسے ایک ممتاز اور منفرد تخلیقی صنف کا مرتبہ عطا کرتی ہیں۔

2۔ انشائیہ کی شناخت

جہاں تک انشائیہ کی شناخت کا تعلق ہے یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے لفظ سے اصطلاح اور اصطلاح سے صنف بننے تک کے تاریخی عمل کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ انشائیہ کے اس تاریخی سفر کا جائزہ لینے کے لیے درج مراحل کا ذکر ضروری ہے:

(ا) انشاء کا لفظ بطور ماخذِ انشائیہ (انشاء نگاری):

انشائیہ کا مادہ ' انشا' یا ' نشا' ہے اور یہ دونوں مادے عربی الاصل ہیں۔ اردو زبان میں "انشاء" کے لغوی معانی" عبارت۔ لکھائی۔ تحریر۔ طرز (بطور اسمِ نکرہ) عبارت یا تحریر لکھنا (بطور فعل) وغیرہ کے ہیں۔ چنانچہ اس مادے کی رو سے انشائیہ کے معنی ہیں 'طرزِ تحریر' ' ا۔ انشائیہ کا ایک مادہ "نشاء" بھی ہے۔ جس کے لغوی معنی 'پیدا کرنا' کے ہیں۔ یوں انشائیہ کا مطلب ہوا "نئی تخلیق"۔ چونکہ انشائیہ نگار تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے ہر چیز کو نئے اور انوکھے زاویے سے دیکھتا ہے اس لیے اس کی تحریر کو تخلیقِ نو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن انشائیہ کا مادہ" انشاء "عربی میں علمِ نحو کی ایک اصطلاح "جملہ انشائیہ" کی حیثیت میں استعمال ہوتا ہے۔ جملہ انشائیہ سے مراد وہ جملہ ہے جس میں سچ جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ جملہ انشائیہ میں فعلِ امر اور فعلِ نہی کے جملے، استعجابیہ اور استفہامیہ جملے اور حروفِ ندا و تحسین و تمنیٰ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال درج ذیل حیثیتوں میں ہوتا رہا ہے:

(الف) سرکاری فرامین کو "انشاء"، اور ان کے جاری کرنے والے دفتر کو "دارالانشاء" اور اس دفتر کے افسر کو "دبیر الانشاء" کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں منشی کریم الدین انسپکٹر مدارس جنہوں نے ۱۹۲۳ء میں اس وقت کے انگریز ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن میجر فلر کی ایما پر مدارس کے نصاب کے لیے "انشائے اردو نستعلیق" نامی کتاب لکھی، وہ لکھتے ہیں:

> "انشا کے معنی لغت میں لکھنا اور پیدا کرنا ہے۔ اور اصطلاح میں وہ فن ہے جس سے طریق لکھنے خطوط اور کاغذات مروجہ، معاملات دنیاوی اور دفاتر سرکاری کے معلوم ہوں۔"[19]

(ب) سرکاری خطوط کے ساتھ ساتھ عام خطوط کے مجموعوں کو بھی انشاء کہا جاتا رہا ہے جیسے "انشائے بے نقاط" "انشائے غالب" "انشائے سرور، انشائے بہارِ بے خزاں" "انشائے داغ"، "انشائے مومن"

(ج) بعد ازاں سکول و کالج کی سطح کی مضمون نگاری کو بھی انشاء نگاری کہا جاتا رہا جو اب تک مستعمل ہے۔ اس کے لیے سکول و کالج کی اردو گرامر و کمپوزیشن بکس دیکھ لیں جن کا نام عام طور پر اردو گرائمر و انشا پردازی ہوتا ہے۔

(ii) انشائیہ بحیثیت صفتِ تحریر (انشاءپردازی)

انشاء نگاری کے ساتھ ساتھ ایک اور لفظ انشاءپردازی بھی اختیار کیا گیا جو ایسی نثر کے لیے مستعمل رہا ہے جو مقفع ، مسجع، مرجز، عاری اور بدائع وصنائع لفظی و معنوی سے مزین ہو اور اشعار کی فراوانی، تشبیہ واستعارہ کی بھرمار اور شعوری کوشش سے چنیدہ الفاظ کا استعمال ایسی عبارت کو رنگینی اور نقش طرازی کا مرقع بنادے۔ کئی نقاد اس طرح کے انشائی نمونوں کو بھی انشائیہ قرار دیتے ہیں حالانکہ انشاپردازی کوئی صنفِ ادب نہیں بلکہ ایک وصفِ عبارت، حسنِ تحریر اور سامانِ آرائش وزیبائش و میک اپ ہے جسے تقاریر، خطوط، داستانوں، کہانیوں، شاعری، مقالات، مضامین، شذرات، مراسلات اور رقعات وغیرہ کی عبارت کو دلکش اور دلفریب بنانے کی لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یادرہے کہ انشاء پردازی کے نمونے جملہ اصناف مثلاً افسانہ، ناول، داستان، شاعری، خطوط، مضمون، تاریخ، تنقید، تحقیق، خطابت وغیرہ میں بھی موجود ہیں اور موجود ہو سکتے ہیں سوائے انشائیہ کے، جو انشاپردازی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود انشاپردازی اور انشائیہ نگاری کو ایک ہی چیز قرار دینا تعصب یا نادانی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

(iii) انشائیہ بحیثیت قسمِ مضمون (مضمون نگاری)

انشاپردازی کا لفظ تو فارسی سے آیا ہے اور اردو میں کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے لیکن انشائیہ کا لفظ پہلی مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد نے استعمال کیا اور وہ بھی گرامر کی اصطلاح ''جملہ انشائیہ'' کے معنی میں۔ البتہ انشائیہ کو شعوری طور پر انگریزی لائٹ ایسے کے معنی میں پہلی بار اختر اورینوی نے سید علی اکبر قاصد کے مجموعۂ مضامین ''ترنگ'' کے دیباچہ میں استعمال کیا۔ لیکن اختر اورینوی کے اس دریافت شدہ لفظ کو یاروں نے ہر قسم کے مضامین، مقالہ جات اور صحافتی مضامین کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے نہ صرف لائٹ پرسنل ایسے کے لیے مختص کیا بلکہ اسے اس کی اصل شناخت عطا کی۔ اس سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کچھ نقاد اور ادباء نے انشائیے کو مضمون سے الگ تو مان لیا تھا مگر وہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور انشائیے میں فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ آخر کار ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے مجلہ '' اوراق'' کی کوششیں رنگ لائیں اور اور بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں انشائیے کے نام پر اڑنے والی گرد بیٹھ گئی اور مطلع صاف ہو گیا۔

(iv) انشائیہ بحیثیت صنفِ ادب (انشائیہ نگاری)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انشاء سے انشاء پردازی کا سفر در حقیقت انشائیہ کا عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو کی طرف سفر ہے۔ پھر انگریزی ایسے کی شمولیت نے پہلے اسے مضمون پھر طنزیہ ومزاحیہ اور آخر میں لائٹ پرسنل ایسے بننے کا موقع عطا کیا۔ اور یوں انشائیہ اپنے صحیح مقام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور آخر کار اسے مضمون کی صنف سے الگ صنف کا درجہ مل گیا۔ اور اب یہ اردو زبان کی ایک الگ صنف کی حیثیت سے زندہ ہے اور اس صنف میں نہ صرف بے شمار انشائیے اور ان کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور مسلسل چھپ رہے ہیں بلکہ انشائیے کی تنقید پر بھی درجنوں کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے (ادبِ لطیف یا انشائے لطیف نہیں)۔ انشائیہ نگار کبھی معلمِ اخلاق، واعظ، ناصح، مصلح یا مدرس کا روپ نہیں دھارتا بلکہ وہ قاری کو ایک بے تکلف دوست کی طرح یار! دوست! اوئے! کہہ کر خطاب کرتا ہے اور ایک ہم جلیس وہمراز کی طرح قاری پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی اس پر ظاہر کرنے سے نہیں ہچکچاتا۔ انہی صفات کی عدم دستیابی کی وجہ سے فرانسس بیکن سے لے کر رچرڈ اسٹیل تک تمام ایسے اسٹ (مضمون نگار) ابراہیم کاولے، لیمب، ہیزلٹ وغیرہ چند انشائیہ نگاروں کو چھوڑ کر، مشیل دی مانتین کا ایسائی (انشائیہ) لکھنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

انشائیہ نگار زندگی اور کائنات سے جڑی ہر چیز کو موضوعِ بناتا ہے۔ وہ صرف اعلیٰ، خوبصورت، اچھی، اہم، محمود اور مرغوب چیزوں کو ہی انوکھے اور نرالے روپ میں پیش نہیں کرتا بلکہ بدصورت، بری، ادنیٰ، معمولی، مذموم اور مکروہ اشیاء کو بھی ایسے زاویوں سے پیش کرتا ہے جو قارئین کے لیے حیرت بھری مسرت کا موجب بنتی ہیں۔ انشائیہ نگار مشاہدے کی تیزی، مطالعے کی گہرائی اور ذہن کی طبّاعی کا حامل ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی موضوع کے ساتھ سفر کرتے کرتے اچانک واپسی کی راہ اختیار کر کے قاری کو چونکا بھی دیتا ہے اور اس کو بور ہونے سے بھی بچا لیتا ہے۔ انشائیہ نگار ایسی خوبصورت فکری لہریں پیش کرتا ہے کہ قاری زمین کی پستی پہ ہوتے ہوئے خود کو آسمان پر محوِ پرواز محسوس کرتا ہے وہ کھلے ذہن اور روشن آنکھ سے زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انشائیہ نگار وہ حساس دل تماشائی ہے جو کسی منظر کو ایسے زاویے سے دیکھتا ہے کہ اس منظر کے کسی اور تماشائی کو ویسے زاویے سے

دیکھنانصیب نہیں ہوتاخواہ اس کا تماشائی کوئی افسانہ نگار ہو، ناول ڈرامہ نگار ہو، داستان گو ہو، نگار ہو، کہانی نویس ہو یا مضمون نگار البتہ شاعر کو کسی حد تک مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

انشائیہ میں اسلوب کی تازگی کا برقرار رہنانہایت ضروری ہے۔انشائیہ نگار ایسا اسلوب اپنائے جو مضمون اور افسانیو غیرہ سے بالکل مختلف ہو۔انشایئے کا موضوع اتنا سکڑا ہوانہ ہو کہ احساس کا وجود خطرے میں پڑ جائے اور نہ اتنا پھیلا ہوا ہو کہ داستان بن جائے۔انشائیہ نگار جن اشیاء کو انشایئے کا موضوع بنائے ان کے مخفی مفاہیم تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو۔انشائیہ نگاری اشیاء اور مظاہر کے معروف معانی اور ان کے متعلق عام معلومات سے ہٹ کر ان کے باطن کے سمندروں کی غواصی اور ان میں پوشیدہ موتیوں کو نکالنے کی سعی کا نام ہے۔

"انشاء نگاری"، "انشاء پردازی" اور "انشائیہ نگاری" تینوں اصطلاحات اپنی اپنی الگ حیثیتوں کی حامل ہیں۔انشاپردازی ایک ' اسلوب' کا نام ہے، انشاء نگاری مکتوب نگاری کی ایک قسم ہے جبکہ "انشائیہ" ادبِ عالیہ کی ایک منفرد "صنف" کا نام ہے

3۔ اردو انشائیہ اور اردو انشائے لطیف

بعض ناقدینِ ادب نے انشائے لطیف کو بھی انشائیہ قرار دیا اور بعض نے کچھ کم ستم ڈھاتے ہوئے انشائیہ کو انشائے لطیف کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا۔ حالانکہ انشائیہ مانتین کے ایسائی اور انگریزی کے پرسنل لائٹ ایسے کی اردوائی شکل ہے۔البتہ انشائیہ پر ادبِ لطیف کے اثرات صرف اس کے اسلوب کی حد تک ہیں۔ بعض مقامات پر انشایئے اور ادبِ لطیف کی مشابہت کی وجہ سے بعض ناقدینِ ادب کو جو الجھن پیدا ہوئی ہے اسے دور کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انشایئے اور ادبِ لطیف کا تقابلی جائزہ لیا جائے تاکہ قاری کے لیے ادبِ لطیف (انشائے لطیف) اور انشایئے کی الگ الگ شناخت آسان ہو جائے۔ادبِ لطیف ایک طرزِ انشا بھی ہے، ایک اسلوب بھی ہے اور ایک رجحان بھی۔ادبِ لطیف کے لکھنے والے ادباء نفسیاتی طور پر باغیانہ خیالات کے حامل اور عام روش سے ہٹ کر چلنے والے ہوتے ہیں، ان کی بغاوت انہیں یہاں تک اکساتی ہے کہ وہ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ادبِ لطیف کے لکھنے والے " ادب برائے ادب" کے نظریہ کے حامی ہیں۔ان کے نزدیک تخلیق کا ظاہری حسن ہی اہمیت رکھتا ہے ۔ فن پارہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی اس بات سے انہیں کوئی غرض نہیں

ہوتی۔ چونکہ وہ حسن پرست ہوتے ہیں اس لیے وہ رومانی موضوعات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے اکثر موضوعات قاری کو حسن و عشق کی دلفریب وادیوں کی مسحور کن فضا میں لاکر فطرت کی رعنائی سے لطف اندوز ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کرتے ہیں اور بسا اوقات عورت اور جنس کے دائروں میں ہی حرکت پذیر رہتے ہیں۔ ان کے نظریات میں انفرادیت کی جلوہ فرمائی ہے۔ وہ مغربی نثر نگاروں سے متاثر ضرور تھے لیکن مرعوب نہ تھے ۔انہوں نے شعوری طور پر اردو نثر کو نازک خیالی اور لطافتِ تخیل سے اس قدر مالامال کیا کہ وہ انگریزی کے کلاسیکی اور رومانی نثر نگاروں کی تحریروں کے ہم پلہ ہوگئی۔ نیز انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات ایجاد و دریافت کر کے اپنی آزاد روی کا ثبوت بھی فراہم کیا اور اردو زبان کو ترقی دینے میں بھی قابلِ قدر حصہ ڈالا۔ ادبِ لطیف کے لکھنے والے بلا کی خود اعتمادی اور انفرادی سوچ کے حامل تھے۔ یہ انشاپردازی کی معروف روش سے ہٹ کر مغرب کے لائٹ ایسّے کو اپنانے کی شعوری کوشش تھی۔ درحقیقت ادبِ لطیف وسعتِ علم، شاعرانہ احساس، حکیمانہ نزاکتِ خیال، رومانی تخیل کی حسن کاری، تراکیب کی شگفتگی، الفاظ کی مینا کاری اور طرزِ ادا کی لطافت کے سدا بہار پھولوں کے خوبصورت گلدستے کا نام ہے، جب کہ انشائیہ ادبِ لطیف سے بالکل الگ تھلگ اپنی شناخت رکھتا ہے۔

4۔ علمِ نفسیات کی روشنی میں انشائیہ کا جائزہ

انشائیہ ایک صنفِ ادب ہے اور ادب کو تخلیق کرنے والے کو ادیب یا تخلیق کار کہتے ہیں۔ گویا ادیب یا تخلیق کار اور ادب یا تخلیق کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ پس یہ ضروری ہے کہ تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے تخلیقی عمل کے باہمی ربط و تعلق کا مطالعہ کیا جائے اور یہ مطالعہ اس وقت تک بامقصد نہیں ہو سکتا جب تک اسے علم نفسیات کی روشنی میں نہ سمجھا جائے۔ علمِ نفسیات کے ذریعے ہم ادب کا مطالعہ اس کی مثالی اور انفرادی حیثیت سے کرنے کے بعد اس کے تخلیقی عمل کے سرچشمے کا راز پا سکتے ہیں۔ اور اس طرح ہم جان سکتے ہیں کہ اس کا تخلیقی عمل کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے اور اس کے اظہار کی شکل کیوں مخصوص ہوتی ہے؟ فرائیڈین ماہرینِ نفسیات کی نظر میں تخلیقی عمل ایک نیوراتی عمل ہے۔ کیونکہ فن کار حقیقت سے ناآسودگی کے باعث تمثیلی طور پر اپنی شخصیت کو پراجیکٹ کرتا ہے۔ جو لوگ فنکارانہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں وہ تکمیلِ خواہش

کے تصورات کو فن کے ذریعے خارجی اشکال میں پیش کر کے آسودگی حاصل کر لیتے ہیں۔اور اس طرح وہ حقیقت سے اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔اس لیے فرائیڈین نقاد فن کا تجزیہ اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ کس حد تک کوئی ادیب یا تخلیق کار اپنے نیوراسس کو بلند کر کے تمثیلی طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔یعنی فن کے بجائے فنکار کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ادیب اپنے میلان سے نیوراتی (سودائی یا دماغی خلجان میں مبتلا) ہوتا ہے لیکن ادیب ہونے کے ناطے اس کا حشر ایک نیوراتی کی طرح نہیں ہوتا۔کیوں کہ وہ اپنے فن کے ذریعے حقیقت سے از سرِ نو اپنا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔

تخلیقی عمل انسان کا وہ وصف ہے جو اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ تخلیقی عمل کے ذریعے ہی نئی چیز ایجاد کرتا ہے۔اس ایجاد کا تعلق خواہ کسی سائنس یا ٹیکنالوجی سے ہو خواہ ادب و فن سے ۔ تخلیقی عمل انفرادی ہوتا ہے۔یعنی ایک فرد ذات کے اندر وجود میں آتا ہے۔انشائیے کے عمل کا سرچشمہ ہمیشہ انشائیہ نگار کی ذات ہوتی ہے۔دوسرے لوگوں کی شمولیت ہونے کے باوجود اس کی داخلی واردات میں شریک نہیں ہو سکتے۔اس پلصراط سے صرف انشائیہ کے تخلیق کار ہی کو گذرنا ہوتا ہے۔انکشافِ ذات کی یہ قیامت انشائیہ نگار کے اندر ہی بپا ہوتی ہے۔انسانی تاریخ میں انسان کو انفرادی آزادی ہی نے تخلیق کار بنایا ہے۔آمریت و شہنشاہیت کے دورِ جبر و استبداد میں آزادیٔ اظہار لاکھوں میں کسی ایک پیکرِ جرأت و عزیمت ہی کو نصیب ہوتا ہے۔اس لیے اکثر اصنافِ ادب میں تخلیق کار کی آزادیٔ اظہار اور انفرادی کوشش ہی تخلیق کا سبب بنی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں آزادیٔ اظہار انشائیہ نگار کو ہی حاصل ہے۔انشائیہ ہی وہ تخلیق ہے جو عام چیز کے مشاہدے سے ایسی انوکھی باتیں تخلیق کرتا ہے جو شاہد و ناظر کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ تخلیق کا یہ عمل کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں ہوتا ہے لیکن مجہول شکل میں جب کہ معروف شکل میں اس کا وجود کم لوگوں میں ہوتا ہے۔

اردو ادب پر فرائیڈ اور دیگر ماہرینِ نفسیات کے اثرات بھی کچھ کم نہیں۔افسانے میں عصمت چغتائی،احمد علی،قرۃ العین حیدر،حسن عسکری وغیرہ متاثر ہوئے ہیں۔عصمت چغتائی فرائیڈ سے متاثر ہوئی۔سعادت حسن منٹو فرائیڈ سے زیادہ متاثر تو نہیں لیکن جنس کو موضوع بنانے کی وجہ سے اسے بھی فرائیڈین ہی کہا جاتا ہے ۔ قرۃ العین حیدر نے شعور کے بہاؤ کو استعمال کیا۔احمد علی نے سررئیلسٹ surrealist طرز کے افسانے لکھے۔ حسن عسکری نے شعور کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آزاد تلازم کو بھی برتا ہے۔

''شعور کا بہاؤ'' تحلیلِ نفسی سے متاثر ایک تکنیک ہے۔اس تکنیک کے ذریعے ذہن کی تصویر اور تصورات کے غیر منظم تسلسل کو پیش کیا جاتا ہے۔یہ تصورات باہم مربوط تو ہوتے ہیں لیکن یہ ربط منطق یا استدلال کے باعث نہیں بلکہ ذہن کی ہر لحہ بدلتی ہوئی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔اس میں بیانیہ تسلسل نہیں ہوتا۔ذہن میں ہی جو عمل ہوتا ہے اسے پیش کر دیا جاتا ہے۔

انشائیہ میں بھی شعور کے بہاؤ کو استعمال کیا جاتا ہے۔انشائیہ میں کسی چیز یا موضوع کے باطن میں جھانکنا پڑتا ہے۔پیاز اور بند گوبھی کی طرح کئی چھلکے اتار کر تہہ تک جانا پڑتا ہے۔شعور سے تحت الشعور اور تحت الشعور سے لاشعور تک کا سفر بھی پرتیں اتارنے کی طرح ہی ہے۔پرتیں اتارنے اور گہرائی تک جانے کا یہ تخلیقی عمل ایک طنز و مزاح نگار کی نظر سے ہمیشہ ہی اوجھل رہتا ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ کے مطابق جنسی ناآسودگی اور احساسِ کمتری ہی ادب کے محرک ہوتے ہیں ادیب اپنی کمی فن کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔انشائیے اور فرائیڈ کے نظریے میں بڑا فرق یہ ہے کہ دوسری اصناف کے برعکس انشائیہ نگار کا محرک نہ تو اس کی جنسی ناآسودگی ہوتی ہے نہ احساسِ کمتری۔وہ نہ تو ایک مزاح نگار کی طرح احساسِ کمتری کا اور نہ طنز نگار کی طرح احساسِ برتری کا شکار ہوتا ہے۔اور نہ ہی انشائیہ اپنے لکھاری کو یا قاری کو کوئی جنسی آسودگی فراہم کرتا ہے۔بلکہ انشائیہ مسرت، بہجت اور شگفتگی عطا کرتا ہے جو ایک بالکل مختلف چیز ہے۔

سررئیلزم (surrealism) جسے اردو میں ماورائے حقیقت یا واقعیت کہتے ہیں، فرائیڈ سے متاثر ایک تھیوری ہے۔اس تھیوری کا مقصد تحت الشعور میں ڈوب کر فن کی تخلیق ہے۔سررئیلزم خواب اور حقیقت کا مقامِ اتصال ہے۔سررئیلزم مشاہدے کے بجائے وجدان، تجزیہ کے بجائے امتزاج اور حقیقت کے بجائے تمثیل کی طرف لے جاتا ہے۔اس نظریے کے پیروکار خیالات کو خودکار ہونے دیتے ہیں اور تخیل کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں تاکہ لاشعور کے چشمے سے مستفید ہو سکیں۔سررئیلزم نے نہ صرف فرائیڈ کے نظریات کو قبول کیا بلکہ ژونگ کے اجتماعی لاشعور کے نظریے سے بھی استفادہ کیا۔ سررئیلزم کی تحریک کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو جی چاہے بغیر سوچے سمجھے جو خیالات جس انداز سے آئیں لکھتے جاؤ۔اگر سررئیلزم کی تحریک کا بغور جائزہ لیا جائے تو واضح ہو گا کہ اس ادبی

تحریک نے دو حوالوں سے مروجہ طریقِ کار کے خلاف کام کیا۔یعنی موضوعات اور طریقۂ اظہار میں تبدیلی اس تحریک کا محرک تھی۔ یہاں انشائیہ اور سررئیلزم میں مماثلت یہ ہے کہ انشائیہ نگاری سررئیلزم کی طرح کسی مدار میں مقید نہیں ہوتی بلکہ جدھر جی چاہے ادھر بڑھتی ہے۔اور جو چاہے لکھ دیتی ہے۔ لیکن اس کی یہ کوشش شعوری ہوتی ہے۔البتہ اشیا کے بارے میں انوکھے پہلو سامنے لانے میں لاشعور کی مدد ضرور ہوتی ہے۔ایک مسلمہ حقیقت کو نئے انداز سے دیکھنا ہی تخلیقی تجربہ ہے۔اور یہ تخلیقی تجربہ انشائیہ نگار کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کے شعور اور لاشعور کا باہمی فرق بہت کم ہوتا ہے کیونکہ فن کار کے شعور اور لاشعور کے درمیان انتہائی باریک پردہ حائل ہوتا ہے جس کے اٹھتے ہی لاشعوری شعاع شعور پر پڑتی ہے۔اس سے تخیل تخلیق کی طرف جست لگاتا ہے۔یہ روشنی صرف مخصوص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔اور یہی لوگ صحیح معنوں میں فن کار ہوتے ہیں۔انشائیہ نگار بھی ایسے ہی مخصوص فن کاروں میں سے ایک فن کار ہوتا ہے۔

5۔ انشائیہ اور مضمون میں فرق

انشائیہ کا بانی فرانس کا ایک فلسفی مشیل دی مانتین ہے۔مانتین نے اس صنف کو Essai کا نام دیا۔ مضمون انشائیے سے پہلے بھی ایک الگ تھلگ صنف کی حیثیت سے موجود تھا البتہ انشائیے کی ایجاد کا سہرا مانتین کے ہی سر ہے۔ جان فلوریو کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر فرانسس بیکن نے لکھنا شروع کیا اور اپنی تحریروں کو جو مضمون کی صنف میں تھیں غلط طور پر انشائیہ قرار دیا حالانکہ مضمون اور انشائیہ دو الگ الگ اصناف ہیں۔ان کی ہیئت کی ظاہری مشابہت کی بنا پر انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں کبھی انہیں ہر قسم کے مضامین کے لیے استعمال کیا گیا اور کبھی انشائیہ کو مضمون کی ایک قسم قرار دیا گیا۔انگریزی میں یہ غلط فہمی چارلس لیمب نے اور اردو میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ختم کی اور اور یجنل ایسسے کو دوبارہ نمایاں کیا۔

مضمون میں موضوع سے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں مگر انشائیہ میں موضوع سے جڑی ہر بات چاہے بے ربط ہی کیوں نہ ہو بیان کی جاسکتی ہے۔ مضمون میں مضمون نگار ایک موضوع کی چار دیواری میں قید ہوتا ہے جب کہ انشائیے میں آزادی ہوتی ہے۔ مضمون میں مواد کی پیشکش میں ایک منطقی ربط ہوتا ہے۔انشائیہ کے موضوع کا انشائیے کے تمام مواد سے ربط و تعلق تو ہوتا ہے لیکن غیر منطقی اور غیر رسمی۔ جتنی مضمون میں معلومات

کی اہمیت ہے انشائیے میں اتنی ہی کم ہے جب کہ انشائیے میں جتنی اہمیت تاثرات کی ہے مضمون میں اتنی ہی کم۔ مضمون کے مقابلے میں انشائیہ کا اسلوب تازہ اور شگفتہ ہوتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق مضمون اور انشائیے میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مضمون نگار خود سوچتا ہے اور قاری بغیر سوچے موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں نہ صرف انشائیہ نگار خود سوچتا ہے بلکہ وہ قاری کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

عدم تکمیلیت مضمون کی خامی ہے مگر یہی انشائیے کی خوبی شمار ہوتی ہے۔ انشائیے میں عدم تکمیل سے مراد اس کے موضوع کی غیر سالمیت یا تشنگی ہے۔ کسی بھی موضوع پر انشائیہ نگار جب اظہارِ خیال کرتا ہے تو وہ بات سے بات پیدا کرتا ہے اور مرکزی بیان کو واضح کیے بغیر کسی دوسرے موضوع سے بحث کرنے لگتا ہے۔ اس لیے بغیر کسی دلیل اور وضاحت کے انشائیہ نگار انشائیہ کا آغاز کر سکتا ہے۔ اس میں نہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں نہ حقائق کی روشنی میں اس کی وضاحت ہی کی جاتی ہے۔ بلکہ انشائیہ کی مثال اس سیلِ رواں کی طرح ہے جو میدانی علاقوں میں پھیلتا جاتا ہے اور جب تھمتا ہے تو ادھر ادھر گڑھوں میں جمع ہو کر مختلف ہیئتوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انشائیہ بھی اچانک شروع ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کا تخیل کئی سمتوں کا سفر اختیار کرتا ہے۔ اس طرح اس کے انشائیے میں موضوع اپنے تمام پہلوؤں کے احاطے کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی کو انشائیے کی عدم تکمیلیت کہتے ہیں۔ مضمون ایسی عدم تکمیلیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ مضمون اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر منطقی ترتیب کے مطابق روشنی ڈالتا ہے۔ اور آخر میں ماحصلات اور نتائج لکھتا ہے۔ نشائیہ کی ایک خصوصیت اس میں ایک خاص لچک کا ہونا بھی ہے۔ لیکن اس کا دار و مدار مصنف کی صلاحیت پر ہوتا ہے جس نے قاری کو دور تک لے جانا ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی پہلو کو تشنہ بھی چھوڑ دے تب بھی قاری اس میں غور و فکر کر کے اس پیس کو بجھا سکتا ہے۔ یہی دعوتِ فکر انشائیہ کا خاصہ ہے۔ جب کہ مضمون نگار اپنے مضمون میں قاری کے لیے کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتا جس کے نتیجہ میں قاری کے لیے خود غور و فکر کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مضمون چاہے علمی ہو، سیاسی ہو، مزاحیہ ہو، تنقیدی ہو، علمی ہو، تحقیقی ہو یا طنزیہ، بیانیہ ہو یا روداد کی شکل میں اس کی ایک مخصوص ہیئت (Format) ہوتی ہے۔ جس میں تمہید، ابتدائیہ، تفصیل، اختتامیہ وغیرہ جیسے ارکانِ مضمون کی ترتیب ایک جیسی ہی قائم رہتی ہے۔ دلائل و براہین کے ذریعے اپنا موقف پیش کیا جاتا ہے۔

انشائیہ اپنے طریقہ کار، مقصد اور اپنی دلچسپیوں کے اعتبار سے مضمون سے الگ تھلگ ایک صنف ہے۔ اسے مضمون کی ایک قسم سمجھنا یکسر غلط ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا بحث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ مضمون کئی طرح کے ہو سکتے ہیں لیکن انشائیہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔

انشائیہ اور مضمون میں ایک اور بڑا فرق انکشافِ ذات کا ہے۔ انکشافِ ذات انشائیے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار غیر شخصی موضوعات پر تنقید یا تبصرہ کرنے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے رد عمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنی ذات کے انوکھے پن کو تلاش کرنا در حقیقت کائنات کو تلاش کرنا ہے۔ اور انشائیہ نگار انکشافِ ذات کے ذریعے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انکشافِ ذات ہی وہ ذریعہ جس سے کام لے کر انشائیہ نگار کا اپنا منفرد نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ انشائیہ موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو اس کے شخصی رد عمل سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مضمون فقط خارجی عوامل پر بات کرتا ہے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کے بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کرتا ہے جب کہ خود مضمون نگار مضمون میں دخیل نہیں ہوتا۔ انشائیہ کا مقصد مسرت انگیزی اور بہجت افروزی ہوتا ہے جب کہ مضمون افادی مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔ انشائیہ اپنی شگفتگی اور تازگی کی بدولت قاری کو حظ و مسرت بہم پہنچاتا اور ذہنی ورزش سے بچاتا ہے اس کے برعکس مضمون علمی تشنگی تو بجھاتا ہے لیکن اس کی خشک بیانی اور مطلق سنجیدگی طبیعت کو بوجھل بنا دیتی ہے اور انسان اکتاہٹ اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مضمون کو پڑھنے کے لیے ایک خاص موڈ بھی ضروری ہے لیکن انشائیہ ہر موڈ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ انشائیے کی شگفتگی یعنی تخلیقی تازگی ہے۔

ایک اور چیز انشائیہ کو مضمون سے الگ کرتی ہے۔ اور یہ چیز مقصدیت اور وعظ و نصیحت ہے۔ مضمون میں یہ چیز اس کی خوبی بن جاتی ہے لیکن انشائیے میں خامی۔ حد سے زیادہ سنجیدگی اور تبلیغی و اصلاحی رنگ مضمون میں تو کھپایا جا سکتا ہے مگر انشائیہ میں ایسا کرنا ممکن نہیں۔

پریم چند نے مجلہ ''زمانہ'' دسمبر ۱۹۰۹ء میں ''گالیاں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ جسے بعض حضرات نے انشائیہ بھی کہا ہے۔ آیئے اس کا ایک اقتباس دیکھتے ہیں:

> اس سے بڑھ کر ہمارے کمینہ پن اور نامردی کا کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آجانا چاہیے ان گالیوں کو ہم دودھ کی طرح پی جاتے ہیں۔۔۔ یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے قومی پستی دلوں کی عزت اور خودداری کا احساس مٹا کر آدمیوں کو بے شرم اور بے غیرت بنا دیتی ہے۔ غصہ میں گالی بکیں دل لگی میں گالی بکیں گالیاں بک کر زورِ لیاقت ہم دکھائیں۔ گیت میں گالی ہم گائیں زندگی کا کوئی کام اس سے خالی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ابھی ہمارے رہنماؤں نے اس وبا کی بیخ کنی کرنے کے لیے سر گرم کوشش نہیں کی۔۔۔ اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔۔۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشتعل کرتی ہیں اور خودداری اور پاسِ عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہمیں دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لیے ضروری ہیں۔[20]

پریم چند نے انتہائی سنجیدگی سے منطقی اندازِ فکر اپنا کر سماج کا جائزہ پیش کیا۔ اس تحریر میں گالیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو ایک معمولی موضوع ہے اس لحاظ سے اس میں انشائیے کی ایک خصوصیت تو پائی جاتی ہے لیکن اسے انشائیہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نہ تو اس میں انکشافِ ذات کی خصوصیت موجود ہے، نہ کوئی انوکھی بات اور نہ کوئی دعوتِ فکر۔ لہٰذا اسے انشائیہ کے بجائے مضمون کے زمرے میں ہی شامل کیا جائے گا۔ اس مضمون کی اشاعت کے تقریباً ستر سال بعد غلام جیلانی اصغر نے اسی موضوع پر یوں خامہ فرسائی کی:

> گالی دینے کا یہ فائدہ یہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے۔ اعصاب کا کھنچاؤ دور ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں سرور کا ایک انوکھا عالم ہوتا ہے۔ پنجاب میں جو آپ کو ہشاش بشاش، بڑی مونچھیں، پر وقار پیٹ اور بڑھکیں مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں تو دراصل اس کی وجہ نہار منہ کی وہ گالی ہے جس پر تمام ملا اور حکیم زور دیتے ہیں۔ گالی جتنی سقیم اور کمزور ہو گی گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی ہو گی۔۔۔ گالی جتنی پر زور اور پر وقار ہو گی شخصیت میں اتنا ہی وقار اور کشادگی ہو گی۔ چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دے گا۔ اور پھر فوراً اپنی ذات کے دڑبے میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن بڑا

آدمی موٹی سی گالی کی کمند پھینک کر اسے دڑبے سے باہر کھینچ لاتا ہے۔ گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔ آمریت صرف اس دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگادی جاتی ہے۔اس لیے ایک اچھے نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہائیڈ پارک کی گنجائش رکھتا ہے۔[21]

مرقومہ بالا انشائیہ میں گالی کو ایک نئے رخ سے دیکھا گیا ہے، س کے خفی مفاہیم تک رسائی حاصل کی گئی ہے، نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے، انسان کی فطرت پر روشنی ڈالی گئی ہے، گپ شپ میں دعوتِ فکر دیتے ہوئے ہلکے پھلکے طنز ومزاح سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور ذات کے کئی اہم گوشے دریافت کیے گئے ہیں۔ پس مرقومہ بالا اقتباسات نے مضمون اور انشائیے کا فرق واضح کر دیا ہے۔

6۔ انشائیہ اور طنز ومزاح

طنز نگاری اور مزاح نگاری جنہیں بعض لوگ ادب کی اصناف سمجھتے ہیں در حقیقت یہ اصناف کے بجائے اوصاف ہیں۔ یہ اوصاف کسی بھی مضمون، کالم، کہانی، انشائیے، افسانے یا ڈرامے وغیرہ میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ جس ادیب کی تحریر میں طنز غالب ہو وہ طنز نگار اور جس کی تحریر میں مزاح کا عنصر غالب ہو وہ مزاح نگار کہلاتا ہے۔ البتہ الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مضمون سراسر طنزیہ ہو یا مزاحیہ۔ یہاں اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ کہیں کسی انشائیے میں ان دو میں سے کسی ایک وصف کا غلبہ ہو جائے تو وہ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون تو کہلا سکتا ہے انشائیہ نہیں۔ انشائیہ نہ تو طنز نگار کی طرح کسی کی جیبیں پر سلوٹیں لاتا ہے اور نہ مزاح نگار کی طرح قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ انشائیہ ہنسائے بھی تو زیادہ سے زیادہ مسکراہٹ لا سکتا ہے ورنہ اندر ہی اندر محظوظ و مسرور کر دیتا ہے۔ اخراجِ جذبات کے معاملے میں بھی ظرافت، طنز اور انشائیہ کا الگ الگ کردار ہے۔ طنزیہ تحریر جذبات کو بھڑکاتی ہے اور مزاحیہ تحریر انہیں سرد کرتی ہے۔ جب کہ انشائیہ انہیں اعتدال پر لاتا ہے۔ اور جذبات کا یہ اعتدال ایک شگفتہ انداز لیے مسرت بکھیرتا نظر آتا ہے۔

طنز کا اصل مقصد ناپسندیدہ افعال یا مظاہر کی روک تھام کرنا ہے اور مزاح جو زندگی کی ناہمواریوں کے شعور کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد بھی ناہمواریوں پر قہقہوں کے ذریعے ایک نرم قسم کی تنقید ہی ہے۔

طنزیہ و مزاحیہ مضامین کو انشائیہ سمجھنے والوں کو یہ غلط فہمی انشائیے کے ایک عنصر "شگفتگی" کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انشائیے کے ناقدین انشائیہ کی اسی خصوصیت کو تخلیقی تازگی یا تازہ کاری بھی کہتے ہیں۔ در حقیقت شگفتگی تخلیقی تازگی کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ انشائیے میں اس خصوصیت کا ہونا ضروری ہے۔ جہاں تک شگفتگی کا تعلق ہے اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ کلام میں بیان کیے جانے والے فرسودہ الفاظ و مضامین کو بھی اس چابکدستی اور مہارت سے پیش کیا جائے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ناگواری و فرسودگی محسوس ہونے کے بجائے مسرت و انبساط کا احساس ہو۔ شگفتگی کا تعلق لفظ اور معنی دونوں سے ہے۔ کلام میں تہہ داری اور گہرائی نہ بھی ہو جب بھی کسی پہلو سے شگفتگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ مزاح اور ظرافت کی شگفتگی عارضی ہوتی ہے جبکہ انشائیے کی شگفتگی دیرپا۔ مزاح کی شگفتگی میں قہقہے لگتے ہیں اور ہنسی چھوٹتی ہے اور آدمی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں جب کہ انشائیے میں پائی جانے والی شگفتگی تبسم کی ایک کیفیت کا نام ہے جو کبھی زیرِ لب اور کبھی پسِ لب ہی رہتی ہے۔

7۔ انشائیہ اور غزل میں حیرت انگیز مماثلت

شعر و ادب کا تعلق بنیادی طور پر شاعر و ادیب کی شخصیت، اس کے مزاج، اس کی افتادِ طبع اور اس کے تجربات و محسوسات کی نوعیت سے ہے۔ یہ تجربات و محسوسات جس قدر حقیقی ہوں گے، ان کی جڑیں زندگی میں جتنی گہری ہوں گی، وران کا رشتہ شاعر یا ادیب کی اصلی شخصیت اور اس کی افتادِ طبع سے جتنا فطری اور حقیقی ہوگا اسی اعتبار سے وہ فن پارے کی تخلیقی شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہوگا۔ اور اس کی تحریروں میں وہ آب و رنگ پیدا ہو سکے گا جن کی بدولت ان کی تاثیر دیرپا اور مستقل حیثیت کی حامل ہو سکے گی۔

انشائیہ ایک نثری صنف ہے جب کہ غزل شاعری کی ایک صنف۔ یوں تو بظاہر دونوں اصناف کا تعلق الگ الگ خاندانوں سے ہے لیکن ان دونوں میں کچھ ایسی خصوصیات اور اوصاف ہیں جو دونوں اصناف میں مشابہت پیدا کرتی ہیں۔ شعری اصناف میں جیسا امتیاز غزل کو حاصل ہے نثری اصناف میں ویسا ہی امتیاز انشائیے کو حاصل ہے۔ یہ دونوں اصناف رمزیت، اشاریت، ایمائیت، خیال آفرینی، ژرف نگاہی، ندرتِ فکر، پرکاری اور شعور و وجدان سے

بھرپور اور جذبۂ احساس کو چھو لینے والی صفات کی حامل ہیں جن کا آئینہ انسان اور انسانی تہذیب کا عکاس ہے۔ زندگی اور کائنات کی پراسرار اور پرت در پرت پیچیدگیوں اور بے کراں وسعتوں کی طرح انشائیہ اور غزل بھی وسیع تر پسِ منظر رکھتی ہیں۔ دونوں اصناف حیات و کائنات کی طرح وسعت پذیر بھی ہیں اور متنوع، رنگا رنگ اور بوقلموں بھی ۔ دونوں اصناف میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر طرح کے موضوعات اس میں مؤثر طریقے سے بیان کیے جا سکیں۔ جس طرح غزل تمام شعری اصناف میں سب سے زیادہ لطیف اور نازک صنف ہے اسی طرح انشائیہ بھی تمام نثری اصناف میں اپنی لطافت اور نزاکت میں منفرد ہے۔

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل موضوع رکھتا ہے یعنی اگر اسے غزل سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ مکمل بات بیان کرتا ہے۔ اسی طرح انشائیے کا ہر پیرا گراف بھی اپنی جگہ مکمل بات بیان کرتا ہے۔ جس طرح غزل کے سارے اشعار الگ الگ مضامین کے حامل ہونے کے باوجود ایک مرکزی خیال اور ایک مجموعی آہنگ میں بندھے ہوتے ہیں اسی طرح انشائیہ کے سارے پیرا گراف بھی ایک مرکزی خیال سے بندھے ہوتے ہیں۔ غزل کی طرح انشائیے میں بھی اشاریت و رمزیت پائی جاتی ہے۔ غزل کا شاعر کفایتِ لفظی کا خاص خیال رکھتا ہے اور ایک وسیع مضمون کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ یہی جامعیت اور کفایتِ لفظی انشائیے کا بھی خاص وصف ہے۔ جس طرح شاعر غزل میں تفصیل کے سمندر کو اجمال کے کوزے میں بند کر دیتا ہے اور اشاروں و کنایوں سے بڑی بڑی باتیں چھوٹے چھوٹے شعروں میں بیان کر دیتا ہے اسی طرح انشائیہ نگار بھی ایمائی اور اشاراتی زبان و اسلوب میں بڑی بڑی باتوں کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں سمو دیتا ہے۔ اشاریت و رمزیت غزل میں ہو یا انشائیے میں، قاری اور سامع کے دل و دماغ کو مفرح اور شاعر یا انشائیہ نگار کے اسلوب کو دلکش بنا دیتی ہے۔ اب انور سدید کے ایک انشائیے سے اشاریت و رمزیت کی ایک مثال دیکھئے:

> ۔۔۔ لیکن صاحب! عجب تماشا ہوا۔ دونوں پرندے ایک دوسرے پر پھرتی سے جھپٹے، دونوں کی چونچیں ایک دفعہ آپس میں لڑیں اور پھر چشم زدن میں ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ سرخ پرندہ آہستہ آہستہ شمال مشرقی سمت میں سرکتا جا رہا تھا۔ سبز پرندے کے پرکا زاویہ ذرا مختلف تھا لیکن پرواز کی غالب سمت وہی تھی، پھر اچانک یوں ہوا کہ سبز پرندے کو پلٹنے کا خیال آ گیا، وہ برق رفتاری

سے الٹے پاؤں مڑا۔اسی لمحے سرخ پرندے کی شہ رگ کٹ گئی اور وہ سر بریدہ، بے دست و پا اسی
سمت لڑھکنے لگا جدھر ہوا اسے بڑھائے لیے جا رہی تھی۔[22]

آپ نے دیکھا کہ انور سدید نے سرخاور سبز پرندوں کی لڑائی میں کس چابکدستی سے بائیں بازو اور دائیں بازو کے نظریات کی آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تلازمۂ خیال انگریزی کے لفظ Association of Idea کا مترادف ہے۔یہ اصطلاح اس ذہنی عمل کے لیے مستعمل ہے جب ذہنِ انسانی کسی ایک چیز کے سہارے سے کسی ایک تصور، یا دیا تمثال ے کسی دوسرے تصور، یا دیا تمثال تک پہنچتا ہے تو ذہن کا یہ عمل تلازمہ یا ائتلاف کہلاتا ہے۔ تلازمۂ خیال انسان کی نفسیاتی کیفیت، ذہنی ترتیب اور اس کے معاشرتی سیاق و سباق پر منحصر ہوتا ہے۔ تلازمۂ خیال تین صورتوں سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خیال کے ساتھ اس کے تمام جزو لازم پیدا ہوں مثلاً باغ کے تصور کے ساتھ پھول، پھل، گھاس، بلبل، بھونرا، باغباں، صیاد، خزاں، بہار، گل چیں وغیرہ کا تصور بھی پیدا ہو جائے دوسری صورت یہ ہے کہ خیال کے ساتھ اس کے مشابہات مثلاً پھول پر چمکنے والے قطرے کو دیکھ کر موتی کی طرف دھیان بٹ جانا۔ااور تیسری صورت یہ کہ خیال کے ساتھ اس کی ضد یاد آجانا جیسے باغ کے ساتھ خزاں اور خزاں کے ساتھ ویرانی، بربادی، تباہی وغیرہ کا خیال پیدا ہو جانا۔ غزل میں صنائع مثلاً تشبیہ، استعارہ، مراعاۃ النظیر وغیرہ تلازمۂ خیال کی مثالیں ہیں۔انشائیہ میں تلازمۂ خیال غزل کی بنسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔بے بات سے بات پیدا کرنا تلازمۂ خیال ہی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔

انشائیے اور غزل کی اہم خصوصیات میں سے ایک تنوع بھی ہے۔ تنوع عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں" قسم قسم کا ہونا"۔غزل کی اصطلاح میں وسعتِ تخیل اور مختلف خیالات وکیفیات کا اظہار تنوع کہلاتا ہے۔یعنی شاعری ہو یا انشائیہ دونوں اصناف میں ہر طرح کے موضوعات و مضامین نئے نئے اور انوکھے پہلوؤں اور زاویوں سے پیش کیے جاتے ہیں۔انشائیے میں تنوع سے مراد موضوع کی تازگی، انوکھاپن اور رنگارنگی ہے۔ تنوع ہی اس کی تحریر میں جان ڈالتا ہے۔ تنوع ہی وہ صفت یا خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہی انشائیے کو مضمون سے الگ صنف کا درجہ ملا۔

شگفتگی کی خصوصیت مزاحیہ مضمون کے علاوہ غزل اور انشائیہ میں بھی ہوتی ہے۔ شگفتگی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی پھول کا کھلنا، خوشی، فرحت وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں شگفتگی سے مراد کلام بیان کیے جانے والے فرسودہ الفاظ و مضامین کو بھی اس چابکدستی سے پیش کیا جائے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ناگواری و فرسودگی محسوس ہونے کے بجائے خوشی و انبساط کا احساس ہو۔ شگفتگی کا تعلق لفظ اور معنی دونوں سے ہے۔ کلام میں تہہ داری اور گہرائی نہ بھی ہو جب بھی کسی پہلو سے شگفتگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ انشائیہ کی شگفتگی اور مزاح کی شگفتگی تو ایک دوسرے کے برعکس ہے مگر غزل اور انشائیے کی شگفتگی بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔

خیال آفرینی، ژرف نگاہی، ندرتِ فکر، نغمگی، پرکاری اور غزل کے مختلف اشعار اور انشائیے کے مختلف پیرا گرافس کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی اور متصل ہونا بھی، یہ سب مشترک اوصاف ہیں۔ انشائیہ پر کیے گئے فنی و موضوعاتی مباحث کو سمیٹتے ہوئے ناقدین کی طرف سے اٹھنے والے دو اہم سوالات کا تحقیقی جواب ضروری سمجھتے ہوئے ذیل میں دیا جاتا ہے۔

8۔ اردو انشائیہ کا بانی

اردو میں انشائیے کے موجد کے بارے میں اکثر نقاد مختلف الخیال ہیں۔ جاوید وششٹ کے نزدیک مانتین اور بیکن کا ہم عصر اردو ادیب ملا وجہی اردو انشائیہ کا بانی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میں ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم قرار دیتا ہوں اور اس کے ان اکسٹھ انشائیوں کو اردو کے پہلے انشائیے۔ یہ نہ فرانسیسی زبان کی تقلید میں تخلیق ہوئے ہیں اور نہ یہ انگریزی ایسّے کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ اردو کے پہلے اور اپنے انشائیے ہیں جو عالمی انشائیہ کے معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔[23]

حالانکہ یہ سب رس کے تمثیلی قصے کے ضمنی پیرا گراف ہیں۔

اکثر اہلِ قلم سرسید احمد خاں کو اردو انشائیہ کا بانی سمجھتے ہیں۔ صاحبِ طرز انشاپرداز علامہ نیاز فتحپوری رقمطراز ہیں: "جیسا کہ سب جانتے ہیں اردو کے سب سے پہلے انشائیہ نگار سرسید مرحوم تھے۔"[25]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:''اردو میں مضمون نگاری کے بانی بھی سرسید ہی تھے۔ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام essay ہے یورپ ہی سے حاصل کی گئی ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> سرسید کے مضامین میں ظرافت کے کچھ انداز ضرور پائے جاتے ہیں مگر وہ خوش طبعی جس سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو شاذونادر ہی محسوس ہوتی ہے۔سرسید کے مضامین اور تصورات میں معقولات کا غلبہ ہے۔زندگی کی دلچسپ تصویریں کم ہیں۔وہ زندگی کے خیال افروز اور دلچسپ مناظر کو کم پیش کرتے ہیں۔اعمالِ انسانی اور ان کے مادی فوائد و نقصانات کی فہرستیں یا ان کی معقول توجیہات پر بہت زور دیتے ہیں۔وہ ہر چند پنچ کے دلدادہ ہیں اور استدلال میں اس سے فائدہ بھی اٹھالیتے ہیں مگر نیچر کے وسیع مرغزاروں کی سیر نہیں کراتے۔ان سب باتوں کے باوجود سرسید احمد خاں اردو کے اولیں مضمون نگار ہیں۔اولیں اس معنی میں کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Essay کی صنف کو اختیار کیا۔[26]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید کو اردو کا اولیں مضمون نگار کہا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Essay کی صنف کو اختیار کیا۔پس یہ کہنا بھی بجا ہے کہ وزیر آغا اردو انشائیہ کے اولیں انشائیہ نگار اس لیے ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر انشائیہ Essai کی صنف کو اختیار کیا ہے۔جب کہ اس سے قبل ملا وجہی، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، اکبر علی قاصد، اختر اورینوی میں سے جس کسی نے انشائیے کی صورت میں جو کچھ بھی لکھا غیر شعوری طور پر لکھا یا بیکن، سٹیل، ایڈیسن، میکالے، کی طرح مضمون نگاری کی اتباع کی۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی رائے بھی یہی ہے۔وہ تحریر کرتے ہیں:"اردو ادبیات میں مضمون نگاری انگریزی ادبیات کے زیرِ اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سرسید اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے۔"[27] پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نزدیک بھی مضمون نگاری کا بانی سرسید احمد خاں ہی ہیں۔وہ رقم طراز ہیں: "اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خان سے ہوا۔انہوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی، فلسفیانہ اور دیگر پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم

عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔"[28] ادھر ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ماسٹر رام چندر کو اردو انشائیہ کا بانی سمجھتے ہوئے ان کے مضامین کے مجموعے کو انشائیے سے موسوم کیا۔ وہ تحریر کرتی ہیں:

> "مضمون نگاری کے ارتقاء مین سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنہوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔"[29]

ڈاکٹر سید ظہیر احمد مدنی نے اپنی مرتبہ کتاب "اردو ایسیز' میں بھی ماسٹر رام چندر کو پہلا مضمون نگار قرار دیا لیکن انہوں نے اس بیان میں مضمون کو مقالہ سے موسوم کیا۔30 ڈاکٹر بشیر سیفی نے اس بارے میں بجا فرمایا:

> یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ماسٹر رام چندر مضمون نگاری میں سرسید احمد خاں کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضمون نگاری میں اصل اہمیت سرسید احمد خاں ہی کو حاصل ہے۔ کیونکہ اردو نثر کی ترویج و ترقی میں نمایاں کام سرسید احمد خاں ہی کا ہے۔ سرسید احمد خاں نے ہی اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی تحریک شروع کی اور خود اتنی زیادہ تعداد میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے کہ نہ صرف مضمون نگاری اردو ادب کی ایک اہم اور مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گئی بلکہ اردو نثر کے سامنے نئے افق بھی روشن ہوتے چلے گئے۔"[31]

جس طرح ڈاکٹر بشیر سیفی نے رام چندر کی اولیت کو تسلیم کرنے کے باوجود سرسید ہی کو اردو مضمون کا بانی کہا ہے ویسے ہی یہ کہنا بھی صائب ہے کہ اورینوی کے انشائیہ کی اصطلاح کو پہلی بار استعمال کرنے، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور خواجہ حسن نظامی سے لے کر سید اکبر علی قاصد کے مضامین تک انشائیہ کے چند ایک اوصاف اور خصوصیات کا سب میں پائے جانے کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کا اردو انشائیہ کا بانی کہلائے جانے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس طرح اردو مضمون کی ترویج و ترقی میں نمایاں کام سرسید احمد خاں کا ہے۔ بالکل اسی طرح اردو انشائیہ کی ترویج و ترقی میں نمایاں کام ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے۔ وزیر آغا نے ہی اردو میں باقاعدہ انشائیہ نگاری کی تحریک شروع کی۔ انہوں نے نہ صرف دوسروں کو انشائیے لکھنے پر اکسایا بلکہ اس صنف ادب کی حدود متعین کرنے اور اس کے خدوخال کی وضاحت کرنے کے لیے مسلسل مضامین بھی لکھے۔ نیز خود اتنی زیادہ تعداد میں مختلف موضوعات پر انشائیے لکھے کہ نہ صرف انشائیہ نگاری اردو ادب کی ایک اہم اور مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گئی بلکہ اردو انشائیہ کے سامنے بھی نئے افق روشن ہوتے چلے گئے۔

وزیر آغا کے اس مقام کا اعتراف متعدد ادیبوں ور نقادوں نے کیا ہے حتیٰ کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے کچھ یوں تھی:

"اردو ناقدین میں اب تک یہ بحث جاری ہے کہ کیا سرسید کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ایسی بحث اور تکنیک پر لکھے گئے دیگر مضامین کا کم از کم یہ نتیجہ تو برآمد ہوا کہ بطور ایک صنف انشائیہ کا نام سنجیدگی سے لیا جانے لگا۔ یوں دیکھا جائے تو ناقدین کی دلچسپی ہی انشائیہ کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔ اس ضمن میں سرِفہرست ڈاکٹر وزیر آغا (خیال پارے، چوری سے یاری تک) ہیں جنہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں اور انشائیوں کے علاوہ "ادبی دنیا" اور بعد ازاں "اوراق" میں انشائیہ نگاری کے لیے باقاعدہ تحریک شروع کی۔ حتیٰ کہ اوراق کے ایک اداریے میں معروف لکھنے والوں کو انشائیہ نگاری کی دعوت دی۔ الغرض انشائیہ کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنے وجود میں ایک تحریک ہیں۔[32]

مشکور حسین یاد رقمطراز ہیں:

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اردو میں جس شخص نے باقاعدہ انشائیہ نگاری کی تحریک چلائی وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "خیال پارے" 1961ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "چوری سے یاری تک" 1966ء، میں منظرِ عام پر آیا۔ "خیال پارے" پڑھ کر مجھے احساس ہوا تھا جیسے آغا صاحب نے اسلوب کے اعتبار سے انگریزی ایسّے اور وہ بھی پرسنل ایسّے کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔[33]

جمیل آذر لکھتے ہیں:

ڈاکٹر وزیر آغا پہلے ادیب ہیں جنہوں نے انشائیہ کے عناصرِ ترکیبی اور اس روح کو دریافت کیا جو انگریزی کے بلند پایہ انشائیوں کے اندر برقی رو کی طرح جاری اور ساری ہے۔ انہوں نے ان مقتضیات کو اردو انشائیہ کا جزوِ لاینفک بنا کر نہ صرف انشائیے لکھے بلکہ اپنے تنقیدی مضامین لکھ کر اس صنفِ ادب کے واضح نقوش کی نشاندہی کی۔[34]

بقول احمد جمال پاشا "ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ "خیال پارے" اردو ادب میں نہ صرف انشائیوں کا اولین مجموعہ ہے بلکہ اردو ادب میں اس کی اشاعت سے انشائیہ کی اصطلاح عام ہوئی ہے اور اس سے انشائیہ کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔"[35]

چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا کے صحیح معنوں میں انشائیہ (essai) گاری کا آغاز کرنے اور اس میں اصلی اہمیت کے حامل ہونے میں کسی شک وشبہ کہ کوئی گنجائش نہیں۔ میری رائے میں جس طرح انگریزی ادب میں بیکن نے مانتین کے ایسائی کے برعکس ایسّے کا آغاز کیا یہاں تک کہ کاولے اور مدت بعد چارلس لیمب نے مانتین کے ایسائی کو زندہ کیا بعینہ اردو میں سرسید احمد خاں کی مثال انگریزی مضمون نگار فرانسس بیکن اور ڈاکٹر وزیر آغا کی مثال انگریزی انشائیہ نگار چارلس لیمب جیسی ہے۔

ج: مانتین کا تصورِ انشائیہ (Montaigne's concept of Essai)

انشائیہ کا بانی مشیل دی مانتین(Michel Eyquem de Montaign(1533-1592 ہے۔ (اس کے نام کا اصل تلفظ ''مشیل دی مانتین'' ہے۔ انگریزی میں اس کو ''مائیکل ڈی مونٹین'' پڑھتے ہیں) وہ فرانس میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی تحریروں کو Essais کا نام دیا جس کا معنی '' کوشش کرنا'' کے ہیں۔ لفظ ''ایسائی'' لاطینی الاصل ہے کیوں کہ لاطینی مانتین کی پسندیدہ زبان تھی۔ بے شک مانتین نے یہ لفظ لاطینی سے لیا ہے لیکن یہ لفظ عربی الاصل ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشاد کی تحقیق کے مطابق ''ایسائی'' عربی الاصل لفظ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہم میں سے بہتوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فرانسیسی زبان کا لفظ Essai در حقیقت فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عربی کا لفظ ہے۔ عربی میں السعی کے معنی کوشش یا کوشش کرنا کے ہیں۔ اور یہی معانی '' ایسائی'' کے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ مونتین جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا اور جنوبی فرانس میں بولی جانے والی زبان شمالی فرانس میں بولی جانے والی زبان سے اس بنا پر ممتاز ہے کہ اس میں عربی زبان کے الفاظ کی بہتات ہے ۔ جنوبی فرانس عربوں کی نوآبادی رہ چکا ہے و محققین نہ صرف وہاں کی بولی پر عربی زبان کے اثرات تسلیم کرتے ہیں بلکہ تمدنِ ہند اور تمدنِ عرب کا مصنف موسیو گستاولی بان وہاں کی آبادی کو بھی عربی النسل بتاتا ہے۔[36]

ڈاکٹر محمد ارشاد کے قیاس کو حقیقت مان لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ عربی کا یہ لفظ لاطینی کے ذریعے فرانسیسی میں داخل ہوا جب کہ لاطینی کا عربی سے متاثر ہونا بھی ثابت شدہ ہے۔ اس کی یہ کوشش حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئی۔ اس کے مضامین کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا یہاں تک کہ جان فلوریو کے ترجمے کے بعد وہ دنیا کے تمام مضمون نگاروں کا پیش رو بن گیا۔ البتہ آنے والے انشائیہ نگاروں نے اس کے اس تصور سے جو اس نے اپنے ایسیز کے لیے

مخصوص کیا تھا، انحراف کرتے ہوئے ہر قسم کے موضوعات پر لکھے جانے والے مضامین کو ایسے ہی کا نام دیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں چارلس لیمب نے مانتین کے تصورِ انشائیہ کی بنیاد پر انشائیے لکھنے کا آغاز کیا اور اس کے لیے پرسنل ایسّے کا نام تجویز کیا۔

مانتین ایک مخلص اور بے ضرر انسان تھا۔ اس کے ہاں داخلیت اور انفرادیت کا غلبہ ہے۔ اس کے اندازِ بیاں میں بے نیازی اور لاابالی پن کی جھلک ملتی ہے۔ اس کا ماٹو ہے Que Saisje؟ جس کا ترجمہ ہے What do I know؟ یعنی میں کیا جانتا ہوں؟ اس نے اپنے ایسیز میں اپنی ذات کو منکشف کیا ہے۔ وہ خارجی اشیا کا مشاہدہ داخلی کیفیات کی روشنی میں کرتا ہے۔ وہ عام اشیا کا ذکر ایسے زاویے سے کرتا ہے کہ ناظر کو اس میں نئی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔

اگرچہ مانتین کا تعلق سیاسی اشرافیہ سے تھا۔ اس کے باوجود وہ درباداری اور عہدوں کی حرص سے بے نیاز ہی رہا۔ یہاں تک کہ اسے نمود و نمائش سے بھی زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ اس نے اپنی جاگیر پر کنجِ تنہائی میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کو سرکاری عہدے پر ترجیح دی۔ اس کے برعکس لارڈ سر فرانسس بیکن نے اپنی عمرِ عزیز کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے اقتدار کے حصول کی کوشش میں صرف کیا۔ وہ ہوسِ اقتدار میں اتنا اندھا ہوا کہ ارل آف ایسیکس Earl of Essex جس نے اس کے اقتدار کے لیے اس وقت ہر ممکن کوشش کی جب اس کے اپنے خالو لارڈ سر ولیم سیل برغلے متہم شاہی خزانہ نے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا، سر بیکن نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے اپنے اس محسن کو بھی ذلیل کرنے میں باک محسوس نہیں کیا۔ مانتین اپنی تصنیف کے آغاز میں قارئین سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> READER, thou hast here an honest book; it doth at the outset forewarn thee that, in contriving the same, I have proposed to myself no other than a domestic and private end: I have had no consideration at all either to thy service or to my glory. My powers are not capable of any such design. I have dedicated it to the particular commodity of my kinsfolk and friends,

so that, having lost me (which they must do shortly), they may therein recover some traits of my conditions and humours, and by that means preserve more whole, and more life-like, the knowledge they had of me. Had my intention been to seek the world¡¯s favour, I should surely have adorned myself with borrowed beauties: I desire therein to be viewed as I appear in mine own genuine, simple, and ordinary manner, without study and artifice: for it is myself I paint. My defects are therein to be read to the life, and any imperfections and my natural form, so far as public reverence hath permitted me. If I had lived among those nations, which (they say) yet dwell under the sweet liberty of nature¡¯s primitive laws, I assure thee I would most willingly have painted myself quite fully and quite naked. Thus, reader, myself am the matter of my book: there¡¯s no reason thou shouldst employ thy leisure about so frivolous and vain a subject. Therefore farewell.)[37]. From Montaigne, the 12th June 1580 (Translated by Charles cotten)

اردو ترجمہ: اے قاری یہ ایک دیانت دارانہ کتاب ہے۔ لہٰذا آغاز میں ہی تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ اس کا واحد مقصدِ تحریر ذاتی اور گھریلو ہے۔ مجھے نہ تو آپ کی خدمت مقصود ہے اور نہ ہی حصولِ شہرت۔ ایسا منصوبہ میری قوت سے باہر ہے۔ یہ تو صرف عزیزوں اور دوستوں کی تفریح طبع کے لیے ہے تاکہ وہ مجھے کھو دینے کے بعد۔ اور جلد ایسا ہونا یقینی ہے۔ میرے کردار اور مزاج کی کچھ

خصوصیات کی بازیافت سے وہ میری یاد کو مکمل اور زیادہ روشن طور پر محفوظ رکھ سکیں۔ میں اگر دنیا کی خوشنودی کا خواہش مند ہوتا تو خود کو زیادہ مکمل اور زیادہ دیدہ زیب لباس میں ملبوس کر کے مزید خوشنما انداز میں پیش کرتا۔ لیکن میں تو اپنے روزمرہ کے سیدھے سادے اور فطری لباس ہی میں رہنا پسند کرتا ہوں اور وہ بھی ہر طرح کے بناوٹ، تصنع اور تکلف سے آزاد ہو کر۔ میں تو اپنی ذات کا مصور ہوں۔ میرے عیوب اور میری خامیاں میری اپنی زندگی کا وہ سبق ہے جو مجھے یاد ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے گا لوگوں کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں اپنی فطری ہیئت میں رہوں گا۔ اگر میری پیدائش ان لوگوں میں ہوئی ہوتی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ ابھی تک فطرت کے بنیادی قوانین ہی کے مطابق آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے بڑی ہی خوشی سے اپنی پوری عریاں حالت میں اور مکمل طور پر خود اپنی تصویر کشی کی ہوتی۔۔۔ لہٰذا اے قاری! اس کتاب کا موضوع میں خود ہوں۔ اس لیے اپنی فرصت کے لمحات ایسے بے ثمر اور غیر سنجیدہ موضوع پر ضائع کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مانتین کی جانب سے الوداع۔

یکم مارچ ۱۵۸۰ء۔ (ترجمہ از راقم)

مانتین کے انشائیے کا مطالعہ ہمیں ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں ہم اس سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک مووی چلنے لگتی ہے جس میں ہم مانتین کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے ایک درجہ آگے بڑھ کر وہ ہم سے مکالمہ بازی کرتے ہوئے اپنی پسند، ناپسند اور اپنی دلچسپیاں تک شیئر کرنے لگتا ہے۔ اور ہم خود اپنی دلچسپیوں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

وہ سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا وہ قاری کی ذات میں خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی خامیوں کو یوں بیان کرتا ہے:

we do not correct the man we hang; we correct others by him. I do the same; my errors are sometimes natural, incorrigible, and irremediable: but the good which virtuous men do to the public, in making

themselves imitated, I, peradventure, may do in making my manners avoided publishing and accusing my own imperfections,

The parts that I most esteem in myself, derive more honour from decrying, than for commending myself which is the reason why I so often fall into, and so much insist upon that strain But, when all is summed up a man never speaks of himself if without loss; a man¡¯s accusations of himse .lf are always believed his praises never translated by CharlesCotton)[38]

کسی مجرم کو پھانسی دے کر ہم اسے نہیں سدھارتے بلکہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کو سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا بھی یہی طریقہ ہے میری خامیاں عام طور پر فطری ہوتی ہیں اور اسی طرح ناقابل اصلاح ہوتی ہیں مگر جس طرح ایماندار لوگ اپنی ذات کی صورت میں دوسروں کے سامنے ایک اچھی مثال پیش کر کے عوام کی خدمت کرتے ہیں تو اس انداز پر میں بھی لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ کس طرح کی باتوں سے اجتناب کریں۔۔۔ میں جب اپنی خامیاں تسلیم کر کے ان کی تشہیر کرتا ہوں تو یقیناً کوئی نہ کوئی خوفزدہ ہو کر اس سے محفوظ رہ سکے گا۔ مجھے اپنی ذات میں جو خصوصیات زیادہ پسند ہیں وہ کسی طرح کی خود تعریفی کے برعکس ذاتی محاسبہ سے معزز قرار پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عام طور پر اس انداز میں بات کرتا رہتا ہوں۔ لیکن سب کچھ کہہ سن کر اتنی بات تو قابل یقین ہے کہ جب انسان اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو اس عمل میں کچھ نہ کچھ گنواتا بھی ہے۔ وہ اپنے بارے میں جتنی بھی خراب باتیں کرے گا وہ سب کی سب درست تسلیم کی جائیں گی۔ لیکن جب وہ اپنی تعریف کرے گا تو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔(اردو ترجمہ راقم)38

مونتین کے انشائیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت میں صحت مند رجحانات، ذوقِ لطیف، حسِ مزاح اور احساسِ توازن کی خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ایک بھرپور وجود، تواناذات، متوازن روح اور کھلے ذہن کی حامل شخصیت تھا۔

مانتین حصولِ علم کا مقصد حصولِ عرفان قرار دیتا ہے۔ اسے صرف مادی دنیا کو ہی اچھا نہیں بنانا چاہتا بلکہ اسے اخروی نجات کی بھی فکر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

I seek, in the reading of books, only to please myself by an honest diversion; or, if I study, 'tis for no other science than what treats of the knowledge of myself, and instructs me how to die and how to live well (Translated by Charles cotton)[39]

ترجمہ:۔ میں صرف اپنا رخ دیانتداری کی طرف پھیر کر اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کتب کا مطالعہ کرتا ہوں؛ یا اس لیے کہ خودشناسی کا علم حاصل کروں۔ اور یہ وہ علم ہے جو مجھے اچھے طریقے سے مرنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ (مترجم راقم خود)۔

انشائیہ نگار کو زندگی، اشیاء، وقوعات اور حوادث کے نارے میں نگاہ کی وسعت اور اس کی حدود کا اندازہ ہونا چاہیے۔ مانتین کی کشادہ ذہنی اور غیر منافقانہ صداقت پسندی ملاحظہ کیجیے:

I hail and caress truth in what quarter soever I find it, and cheerfully surrender myself, and open my conquered arms as far off as I can discover it; and, provided it be not too imperiously, take a pleasure in being reproved, and accommodate myself to my accusers,(Translated by Charles cotten)[40]

میں صداقت کا خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہی کیوں نہ ملے، خیر مقدم کرتے ہوئے اسے گلے لگالیتا ہوں۔ میں اس کے سامنے بخوشی شکست تسلیم کرتا ہوں اور اسے فاصلہ پر ہی دیکھ کر اپنے

شکست خوردہ ہتھیار پیش کر دیتا ہوں۔ اگر بات کرنے والے کا رویہ متکبرانہ نہ ہو اور نہ ہی وہ حاکمانہ انداز میں پیشانی پر بل ڈالے تو میں اپنی تحریروں پر ہر طرح کی تنقید سے خوش ہوتا ہوں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح اکثر ادبی تحریکات کا آغاز فرانس سے ہوا انشائیہ کی شروعات بھی فرانس سے ہوئی۔ مانتین دنیاوی کاروبار سے سبکدوش ہو کر زندگی کے آخری ایام گوشۂ عافیت میں گذار رہا تھا۔ اس فارغ وقت میں اس نے انشائیہ لکھنے کا تاریخی کام شروع کیا۔ خود اس نے اپنے اس کام کو کوئی خاص اہمیت نہ دی بلکہ وقت گزاری اور اعزہ واحباب کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کیا لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اسے یہی کام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ مانتین اپنی بات کا آغاز اپنی ذات سے کرتا ہے اور پھر دوسروں کی ذات تک پہنچ کر پوری کائنات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ تاہم وہ آخر میں اپنی ہی ذات میں مدغم ہو جاتا ہے۔ وہ مشاہدے اور تجربے سے بات شروع کرتا ہے۔ پھر اس میں افکار کا رنگ بھرتا ہے لیکن کچھ یوں کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ فکر کا یہ لباس تو اس کا اپنا ہے۔ یہی مانتین کے ایسیز کی کشش کا راز ہے۔ اس کی تحریر میں بے تکلفی اور اپنا پن دیکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیے: وہ اپنے ایسے ''گفتگو کے فن پر'' میں کہتا ہے'

In earnest, I rather choose the company of those who ruffle me than of those who fear me(Translated by Charles cotton

''میں ان دوستوں کی صحبت پسند کرتا ہوں جو مجھے رگیدتے ہیں نہ کہ ان کی جو مجھ سے سہمے سہمے رہتے ہیں۔'' (اردو ترجمہ راقم خود)۔[41]

یوں ایک جست میں وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل آتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ القرآن المجید، سورۃ الفصلت (حٰمٓ السجدہ):53

2. Hudson, An Introduction to the study of Literature, P. No. 332, London, 1558.

3۔ جارج سینٹ بری، بحوالہ صنف انشائیہ اور انشائیے، مرتب سید محمد حسنین، ایوانِ اردو، پٹنہ، چہارم، ۱۹۷۸ء، ص ۳۲

4. E William,A Book of EnglishEssays,p11,London,1930. 5. F H Prechered,Essays of Todays,p11,london,1930

6. House Peterson, Great Essays,p 14, New York. 1945

7. D.Johnson, refer W.H. Hudson, An introduction to the study of Literature, p331 London, 1558

8۔ اختر اورینوی، مقدمہ، مشمولہ 'ترنگ'، مرتب: علی اکبر قاصد، مکتبہ خیال، سبزی باغ، پٹنہ، ۱۹۴۴ء

9۔ عبدالماجد دریابادی، بحوالہ انشائیہ۔ایک ہمہ جہت صنف، سلیم آغا قزلباش، لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۹

10۔ کلیم الدین احمد، پیش لفظ: نشاطِ خاطر از حسنین عظیم آبادی، پٹنہ، ۱۸۹۰ء، ص ۷

11۔ آدم شیخ، انشائیہ، رائٹرز امپوریم لیمٹڈ، بمبئے، اول، ۱۹۶۵ء، ص ۲۶

12۔ سید وجعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء، ۱۳۔۱۴

13۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، ۲۹۹۰ء، ص ۵۰

14۔ ایضاً

15۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو کا بہترین انشائی ادب، میری لائبریری، لاہور، اول، ۱۹۶۴

16۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، فروغِ اردو، لکھنو، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۹

17۔ نظیر صدیقی، شہرت کی خاطر، ڈھاکہ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰

18۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، تخلیقی عمل اور اس کی نوعیت وماہیت، مشمولہ ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور، مدیرہ: صدیقہ بیگم، نومبر/دسمبر 2010، ص 92

19۔ منشی کریم الدین، انشائے اردو نستعلیق، جے۔ایس۔ سنت سنگھ اینڈ سنز، لاہور، 1923ء، ص: 1

20۔ پریم چند، گالیاں (مضمون)، مشمولہ اردو کا بہترین انشائی ادب، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، میری لائبریری، لاہور، اول، 1964، ص 173 21۔ غلام جیلانی اصغر، گالی دینا (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق، لاہور، سالنامہ، 1976، ص: 31

22۔ انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1993ء، ص:

23۔ جاوید وششٹ، انشائیہ پچیسی، سلوجہ پرکاشن، نئی دہلی، 1985ء، ص: 108

24۔ معصوم رضا سید، ڈاکٹر، اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا، نیشنل پرنٹرس، نئی دہلی، 2005ء، ص: 17

25۔ نیاز فتحپوری، مجلہ ادیب، علی گڑھ، انشائیہ نمبر، مئی 1959ء، ص: 9

26۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فکری وفنی جائزہ، مکتبہ کارواں، لاہور، اول 1960ء، ص: 47

27۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامینِ سرسید، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، اول، 1967ء، ص: 6

28۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور 1976ء، ص: 148

29۔ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ، سلسلہ مطبوعات ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد، اول، 1960ء، ص: 52

30۔ نیاز فتحپوری، پیشِ لفظ، اردو ایسیز، مرتب: ظہیر احمد مدنی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۵

31۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشرز، لاہور اول، 1989ء، ص:88

32۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، پنجم، 1978ء، ص:228

33۔ یاد، پروفیسر مشکور حسین، ممکناتِ انشائیہ، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، 1983ء، ص:150

34۔ جمیل آذر، اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1972ء، ص:72

35۔ احمد جمال پاشا، انشائیہ کی اصطلاح، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1983ء، ص:72

36۔ محمد ارشاد، ڈاکٹر، مونتین انشائیہ وانشائیہ نگار، مشمولہ ماہنامہ فنون، مدیر احمد ندیم قاسمی، جولائی۔اگست 1982ء، ص31

37. M.D.Montaigne,,Author to Reader,Essays, translated by Charles Cotten{online}available athttp.www.orst,.edu/instruct/phl302/texts/montaigne/in.essay..,April 10 ,2002

38. Montaigne, Of Books ,Essays,translated by Charles Cotton{online} available at website:

http:/www. orst. edu/instruct/phl 302/texts/montaigne/in essay... , April 10 ,2002

39. Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available

http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

40۔ ایضاً.

41۔ ایضاً.

باب دوم

اردو انشائیے کی روایت اور معاصر اردو انشائیہ نگار

(الف)اردو انشائیے کی روایت

انشائیے کی روایت اور تاریخ ادب میں اس کے نقوش تلاش کرنے اور مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشائیے کے لغوی اورا صطلاحی معنوں کا تحقیقی نظر سے جائزہ لیا جائے۔

عربی زبان میں انشائیہ کے دو مادے ہیں۔ان میں سے ایک مادہ " ا نشا" ہے جس کے لغوی معانی " (الف) عبارت۔تحریر۔ طرز (ب) عبارت یا تحریر لکھنا" وغیرہ کے ہیں۔اس مادے کی رو سے انشائیہ کا معنی 'طرزِ تحریر ' ہوگا۔انشائیہ کا دوسرا مادہ" نشا "ہے ۔جس کے لغوی معنی' 'پیدا کرنا "کے ہیں۔یوں انشائیہ کا مطلب ہوا" نئی تخلیق"۔ علمِ نحو میں ا نشائیہ کا ایک معنی " غیر سنجیدہ تحریر "بھی ہے ۔ اگر مذکورہ بالا تینوں مادوں کو درست مان لیا جائے تو انشائیہ کی تعریف کچھ یوں بنتی ہے" ایسی تحریر جو بظاہر غیر سنجیدہ ہو مگر متعلقہ موضوع بارے میں کوئی ایسانیا اور انوکھا پہلو پیدا کردے جس کی طرف اس سے پہلے قاری کی توجہ نہ گئی ہو۔ " اردو ادب میں اس لفظ کو بطور ادبی اصطلاح کے انگریزی ادب کے Personal / Light Essay کے مترادف کے طور پر لیا گیا ہے ۔

انشائیہ کی اصطلاح کو جسے اب اردوادب میں انگریزی کے لا ئٹ یاپرسنل ایسّے (Personal / Light Essay)کے مترادف کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے،اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت سی منازل قطع اور بہت سے مراحل طے کرنے پڑے ہیں۔انشائیہ کا ماخذ عربی زبان ہے جبکہ عربی زبان میں یہ لفظ 'انشا 'سے ماخوذ ہے جس کا معنی تحریر کرنا ۔ عبارت یا مراسلت ہے۔فارسی وعربی زبانوں میں متعلقہ الفاظ میں انشائے لطیف(ایسی رنگین عبارت جو لفظی

ومعنوی محاسن سے آراستہ وپیراستہ ہو)دارالانشا(وہ محکمہ یاشعبہ جو کسی ادارہ یاحکومت کی جانب سے مراسلت کے فرائض سرانجام دے) انشاپرداز(نثرنگار یامضمون نگار)دبیر الانشا(انشا پرداز ، مکتوب نگاریا مضمون نگار)جملہ ا نشائیہ(علمِ نحو میں وہ جملہ جسے ادا کرنے والے کو سچا یاجھوٹا نہ کہا جا سکے)وغیرہ مستعمل ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد جب فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی تو اردوزبان(جواس وقت ہندوی کہلاتی تھی) میں یہ لفظ ''روزمرو کی تحریر ' 'اور '' عبارت آرائی ''کے معانی میں استعمال ہونے لگا۔بعد ازاں مزید آگے بڑھتے ہوئے اس لفظ کوایسی تحریر سے منسوب کیا گیا جو دل کش ورنگین ،لفظی و معنوی خوبیوں سے مزین،صنائع وبدائع سے آراستہ اور خطابت کی شوکت کی حامل ہو چنانچہ تحریرکا یہی انداز انشاپردازی کہلایا ۔ جہاں تک لفظ "انشائیہ "کو اردو زبان میں پہلی مرتبہ استعمال کرنے کی بات ہے توبجاطورپر اس کا سہرا اردو کے چوٹی کے نثر نگاراورصاحبِ طرز انشاپرداز مولوی محمد حسین آزاد کے سر جاتا ہے جنہوں نے اپنے ایک مکتوب میں ناٹک کی اہمیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس کے لکھنے والے انشاپرداز شمار ہوتے ہیں کیوں کہ فنونِ انشائیہ کا اداکرنا بھی ایک جزوِ اعظم انشا کا ہے۔''[1]

لیکن یہاں پر لفظ انشائیہ انشاپردازی کے معنی میں برتا گیا ہے نہ کہ لائٹ یاپرسنل ایسسے کے معنی میں۔ محمد حسین آزاد کے بعد بھی ہرقسم کے مضامین کے لیے مضمون یا مقالہ کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا رہا۔انگریزی Essay کے لیے لفظ انشائیہ کا پہلی بار استعمال ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر اخترااورینوی نے کیا،وہ سید علی اکبر قاصدکے انشائیوں کے مجموعے''ترنگ ''کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

> اردو ادب میں انشائیو ں اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔کبھی کبھار کوئی اچھاسا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا تو دو گھڑی کے لیے جی بہل جاتا ہے۔انشائیہ نگاری مضمون نویسی کی ایک خاص صنف ہے۔اس کاچرچا مغربی ادب میں تو خاصا ہے مگر مشرقی

ادب میں یہ پھلجھڑی چھوٹتی نظر نہیں آتی۔اردو دنیا میں مضمون نگاروں کی کمی نہیں رہی۔حالی، شبلی، شرر، سرشاراورخواجہ حسن نظامی کے مضامین اور مقالے تو بکثرت ہیں اور ان میں سے بعض مضامین میں انشائیہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔"[2]

اگرچہ اختر اورینوی نے لفظ انشائیہ کو غیر افسانوی ادب میں ایک خاص صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کومضمون نگاری کی ایک خاص صنف قرار دیتے ہوئے مضمون اور انشائیہ کے مابین فرق واضح کیا۔لیکن انشائیہ کا وہ تعارف جو اختر اورینوی نے اس مقدمے میں پیش کیا،نہ ہی علی اکبر قاصد کے انشائیے اس کے مطابق ہیں اور نہ ہی اگلے بارہ سال تک انشائیہ ان کی تعریف سے متفق ہو سکا۔مثال کے طور پر 1957ء میں ظہیر الدین مدنی نے"اردو ایسیز"میں انشائیے کے نام پر مضامین ہی شامل اشاعت کیے۔البتہ علامہ نیاز فتحپوری نے لائٹ ایسے کا مترادف طیفیہ تجویز کیا۔جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

" ایک اور لفظ میری سمجھ میں آیا تھاطیفیہ ۔طیف عربی میں خیال کو بھی کہتے ہیں اوراس روشنی کو بھی جو مثلثی شیشہ جسے منشور(prism) کہتے ہیں،کے اندر سے گذر کر مختلف رنگوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔[3]

1955ء میں مرزا ادیب نے ماہنامہ ادبِ لطیف میں ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ"گرمی کی آغوش " کو انشائے لطیف سے موسوم کیا۔1956ء میں اسی قسم کی تحریر کو مرزا ادیب ہی نے لطیف پارہ کا نام دیا۔1958ء میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کی کتاب"صنفِ انشائیہ اور انشائیے "شائع ہوئی۔اس میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی،عبدالحلیم شرر،خواجہ حسن نظامی ، فرحت اللہ بیگ،ملا رموزی،رشید احمد صدیقی حاجی عبد الخالق لق لق(مدیرلقلقہ)،انجم مانکپوری،احمد شاہ بخاری پطرس،فلک پیما،کرشن چندر ، کنہیا لال کپور،شوکت تھانو ی ،علی اکبر قاصد،ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد جمال پاشا کی تحریریں شامل ہیں۔اس کے بارے میں احمد جمال پاشا کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"ڈاکٹر محمد حسنین کے مقدمے کا بیشترحصہ انشائیے کی تنقید کے متعلق اور گراں مایہ ہے۔مگر ان کے انتخاب میں مضامین بھی شامل ہیں اور انشائیے بھی۔ "[4]

گویا سید محمد حسنین انشائیے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں فرق روا نہیں رکھتے ۔ 1959ء میں مجلہ "ادیب"علی گڑھ نے انشائیہ نمبر شائع کیاجس کے مضامین کو انشائیہ کاہی نام دیاگیا۔یہاں تک کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ڈاکٹر وزیر آغا نے پہلی بارانشائیہ کو اسی روپ میں پیش کیا جو اسے اس کے بانی "مشیل دی مونتین "نے دیا تھا۔۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ" خیال پارے "شائع ہوا جو اردو انشائیہ نگاری کا سنگِ میل ثابت ہوا۔چنانچہ اس سلسلے میں وہ اپنے ایک مضمون میں جو1989ء میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں:

> چونکہ ایسے کے لفظ نے خود مغرب میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا جنہیں ہمارے انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل کیا تھا۔لہٰذا میں چاہتا تھاکہ پرسنل یا لائٹ ایسے کے لیے کوئی نیا اور منفرد نام تجویز کیا جائے۔انہی دنوں میں نے بھارت کے ایک رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا اور یہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے مرزا ادیب صاحب کوجو ان دنوں ادبِ لطیف کے مدیر تھے، اس نام کو پرسنل ایسے کے لیے مختص کرنے کی تجویز پیش کردی جسے انہوں نے فوراًقبول کرلیا۔بعد ازاں معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر محمد حسنین لائٹ ایسے کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کر چکے تھے مگر جس لائٹ ایسے کے لیے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا وہ سرے سے لائٹ ایسے تھے ہی نہیں۔[5]

اردو زبان میں ادبی نثر کا آغازملاوجہی کی سب رس سے ہوا۔ملا اسداللہ وجہی سترہویں صدی کے ربع اول میں قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شا ہ کے عہد میں ملا غواصی کا ہم عصرگذرا ہے۔ملا وجہی کی اس کتاب میں ایسی اکسٹھ تحریریں ہیں جو بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق پندونصائح کے ٹکڑے ہیں جنہیں انہوں نےقصے کی روانی اور تسلسل کی راہ میں حائل رکاوٹیں قرار دیاہے۔ یہی اقتباسات ڈاکٹرجاوید وششٹ کے خیال کے مطابق انشائیے ہیں۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ تحریریں پندو نصائح توہیں جو ہر قصہ یاداستان میں پائے جاتے ہیں لیکن انہیں انشائیے نہیں کہاجاسکتا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انشائیے کے اسلوب کی بنیاد ملا وجہی نے رکھی لیکن یہ کام بھی شعوری طور پر نہیں ہوا ۔لہٰذاجاوید وششٹ کا یہ کہنا درست نہیں کہ ملا وجہی

اردو کے پہلے انشائیہ نگار ہیں۔ملا وجہی کا عہد اردو زبان کا ارتقائی دور تھا۔یہی وہ دور تھا جب فرانس میں مونتین نے انشائیہ لکھا اور انگریزی میں بیکن مضمون لکھ رہا تھا۔رفتہ رفتہ اردو زبان میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس نے ترقی کے مدارج طے کرنا شروع کردیے۔ملا وجہی کی سب رس کے بعد میر محمد حسین عطاخاں تحسین کی نوطرزِمرصع میں انشائیہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ نوطرز مرصع کی عبارت اگرچہ مقفیٰ اور مسجع ہونے کے ساتھ ساتھ عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ وتراکیب سے بوجھل ہے اس کے باوجود اس میں کئی مقامات پر انشائیہ نما پیراگراف ملتے ہیں لیکن پر تکلف اندازِ بیاں اورتصنع نے انہیں بھی انشائیہ نہ بننے دیا۔ نو طرز مرصع کے بعد فسانۂ عجائب اورانشائے سرور میں بھی انشایئے کی جھلکیاں موجود ہیں۔سرور کی عبا رت مقفیٰ و مسجع ہونے کے باوجود تحسین کے مقابلے میں کہیں زیاد ہ بہتر اور انشائیہ کے زیادہ قریب ہے ۔انشایئے کے سب سے زیادہ لوازمات اور خصوصیات کے حامل خطوطِ غالب ہیں جن میں سادگی، پرکاری،آزادانہ تفکر،زندگی اور کائنات کے مظاہر کوایک نئے انداز سے دیکھنے کی قوت اور سلیقہ نیزانشائیہ میں پایا جانے والا غیر رسمی انداز اور گہری سے گہری بات کوسادہ الفاظ میں بیان کرنے کافن، اعلیٰ پائے کی ظرافت،فکروخیال کے انوکھے پہلوؤں کی نمود، شخصی اظہار اورانکشاف ذات جیسی انشائیہ کی بہت سی خصوصیا ت پائی جاتی ہیں لیکن اس سرمائے کا تعلق مکتوب نگاری کی صنف سے ہے نہ کہ صنفِ انشائیہ سے۔

سرسیداحمدخان سے ربع صدی قبل انگریزی ایسے کے زیرِاثر اردو میں پہلی مرتبہ۱۸۴۵ء میں ماسٹر رام چندر نے اپنے پندرہ روزہ مجلے فوائدالناظرین اور ماہنامہ محبِ ہند میں مضامین لکھنے کا آغاز کیالیکن ان مضامین کا بھی انشائیہ کی صنف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ماسٹر رام چندر کے مضامین ادبی بھی نہیں تھے۔ ان کے بعد مضمون نگاری کوسرسید احمد خاں نے ایک منفرد انداز سے شروع کیا اور تہذیب الاخلاق کو سپکٹیٹراور ٹیٹلر کا معیار عطاکیا۔سرسید کے دل میں قوم کی ترقی کا درد موجود تھا۔وہ ہر حال میں اپنی قوم کو انگریزوں کے برابر ترقی کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔اور اس وقت قوم کی اصلاح ہی ان کامقصدِوحید تھا۔ایسے حالات میں ان سے انشایئے کی

شگفتگی ، تازہ کاری، شخصی اظہار اوربے ربط وغیر رسمی طریقِ کارجیسی خصوصیات کی حامل تحریر لکھنے کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔ اس لیے وہ انشائیہ لکھنے کے قابل ہوتے ہوئے بھی مضامین ہی لکھتے رہے ۔البتہ انشائیہ نگاری کی صلاحیت امید، امید کی خوشی، گزراہوازمانہ ،انسان کے خیالات ،کاہلی،خوشامد،بحث وتکراروغیرہ جیسے کئی مضامین سے جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

سرسید احمد خاں کے رفقاء مولانا الطاف حسین حالی،مولوی نذیر احمد،مولاناشبلی نعمانی ،نواب محسن الملک اورمولوی ذکاء اللہ وغیرہ نے مضمون نگاری کی یہی روش اپنائی۔البتہ ان میں سے شمس العلما مولوی ذکاء اللہ)جنہوں نے انگریزی مضامین کے ترجمے کیے (کی تحریروں میں انشائیہ کا رنگ کافی نمایاں ہے۔ ان کے کچھ مضامین بالخصوص" آگ "انشایئے کے بہت ہی قریب ہیں۔ جس طرح بیکن کے مضمون Of Studyکاترجمہ"کتابوں کے بارے میں"انشائیہ نما مضمون ہے لیکن انشائیہ نہیں۔چنانچہ شگفتگی،خوش طبعی ،نکتہ آفرینی اورندرتِ خیال کی صفات کی وجہ سے ان کے مضامین انشائیہ لگتے ہیں۔ لیکن انکشافِ ذات،عدم تکمیلیت ،اسلوب کی تازہ کاری کے فقدان اور سطحی واصلاحی رنگ کی وجہ سے انہیں بھی انشایئے نہیں کہا جاسکتا۔

سرسید کے اسی عہد میں عبد الحلیم شرر بحیثیت انشاپرداز منفرد مقام پر نظر آتے ہیں۔وہ بسیارنویس ناول نگار بھی تھے۔ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز شرر لکھنوی سے ہی ہوا۔ ناولوں کے علاوہ ان کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں۔یہ مضامین مقالات وجذباتِ شرر کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔شرر ایک طرف خالص مذہبی تھے تودوسری طرف خالص مشرقی۔چنانچہ ان کا مذہبی رنگ جس طرح ناولوں میں نظر آتاہے مشرقی رنگ اسی طرح مضامین میں۔ان کے مضامین موضوع کے تنوع،خیالات کی لطافت اورزبان کی دلکشی کی وجہ سے انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔شگفتگی اور بیساختگی کی صفات سے متصف ان کے مضامین انشائیہ کے بہت قریب ہیں۔ان کی اکثر تحریریں انشائیہ نما ہیں مگر کچھ خالص انشایئے بھی ہیں مثلاً"نہیں"۔اس انشایئے میں وہ لفظ "نہیں" کو الٹتے پلٹتے ہوئے ایسے ایسے زاویوں سے دیکھتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے کہ اس لفظ نے اب سے پہلے اس لفظ کو اس رنگ میں کیوں نہیں

دیکھا تھا۔اسی طرح ''آدھی رات،لالہ خودرو،پھول،نسیم سحر، باغ،ایک چھوٹے ذرے کی سرگذشت،بزم قدرت''ان کے بہترین انشائیہ نما مضامین یاانشائیہ کے خام نمونے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک کی ٹھوس عقلیت اورجامد اجتماعیت نے ادب اور زندگی دونوں کوایک نئے موڑ سے آشنا کیا تاہم اس ذہنی وعقلی انقلاب سے گذرنے کے باوجود برِصغیر کے باسیوں نے اپنے ماضی کی قدیم روایت سے اپنا رشتہ یکسر منقطع نہیں کیااور مشرق کے روحانی مزاج نے مغرب کی مادیت کوپوری طرح قبول کرنے پرآمادگی ظاہر نہیں کی۔علی گڑھ تحریک نے فلسفہ اور سائنس کے استفادہ سے اجتماعی بہبود کا راستہ ہموار کیا اور حقیقت پسندی کوفروغ دینے کی سعی کی۔چنانچہ بہت جلد اس تحریک کے خلاف رومانوی نوعیت کا ردعمل ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔اور جذبہ اور تخیل کی وہ رو جسے علی گڑھ تحریک نے روکنے کی کوشش کی تھی، سطح پر ابھرے بغیر نہ رہ سکی۔جذباتی سطح پر اس ردعمل کومثبت صورت میں محمد حسین آزاد، میرناصرعلی دہلوی اور عبدالحلیم شرر لکھنوی نے ابھارا اور ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں ادیب کا تخیل جذبے کی جوئے تیزروکے ساتھ چلتا ہے اور قلم اس کے وجدان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔آزاد کی خیال آفرینی کاسرچشمہ انگریزی انشاپردازی سے پھوٹتاہوا نظرآتا ہے ۔تاہم آزادکی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے متخیلہ کو پابندِسلاسل کرنے کے بجائے آزادیٔ پرواز عطاکی۔اگرچہ رومانوی تحریک علی گڑھ تحریک کاردِعمل تھی لیکن محمد حسین آزاد کی رومانویت کا اس ردعمل سے کوئی تعلق نہ تھابلکہ یہ ان کی اپنی ہی افتادِ طبع کی ترجمان تھی۔ان کی تصانیف میں انشائیہ نما تحریریں موجود ہیں لیکن وہ ترجمہ ہیں نہ کہ تخلیق۔

عہدِسرسید کے منفرد اور صاحبِ طرز انشاپرداز، رمزیہ اور تمثیلی رنگ کے مالک محمد حسین آزاد کی مضمون نگاری اپنے معاصرین کے مقابلے میں یکسر مختلف ہے۔آزاد کا انداز مشرق و مغرب کا حسین سنگھم ہے۔ ان کی تحریروں میں تشبیہ واستعارات کی دلکشی اورالفاظ میں گیت اورسنگیت کا تصور مشرقی رنگ ہے،اور خیال کی سادگی میں مغربیت کی جھلک ، اسلوب کی جدیدیت و انفرادیت سے مملو آزاد کی انشاپردازی ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔انشاپردازی کافن تو

آزاد سے پہلے بھی موجود تھا لیکن اردو میں خالص اورادبی انشاپردازی کے بانی محمد حسین آزاد ہی ہیں۔آزاد نے پہلی مرتبہ انشاپردازی کو مقفیٰ ، مسجّع اورمرجّز اسلوب، ثقیل الفاظ وتراکیب کے بوجھل پن اور نامانوس زبان سے آزادی دلائی۔گویاانشائیہ کے لیے مناسب فضا کوسازگار بنایا۔پروفیسر آزاد کے یہ انشائیہ نما مضامین نہ تومضامینِ سرسید کی طرح اصلاحِ معاشرت اورشعوری تربیت کے منصوبہ بند پروگرام ہیں اور نہ ہی سپرٹ سے خالی بلکہ انکی تحریریں ادبی نقطۂ نظر کی امین ہیں۔ آزاد کی رومانویت علی گڑھ تحریک کے ردعمل میں نہیں اٹھی تھی لیکن میر ناصرعلی نے اس تحریک کوشعوری طور پر تحریکِ سرسید کے ردعمل میں اپنایا۔وہ نہ صرف اس تحریک کے مطلعِ اول ہیں بلکہ انہوں نے خود بھی رومانوی ادب تخلیق کیا۔انہوں نے علیگڑھ تحریک کی خشک کلاسیکیت کوشعری نثر میں تبدیل کیااور ادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف موڑ دیا۔میر ناصرعلی کوبھی اردوانشائیہ نگاروں میں شامل کیاجاتاہے۔انہوں نے اپنے انشائیہ نما مضامین" افکارِپریشاں "کے نام سے اپنی ہی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے" صلائے عام"میں لکھے۔خیالات کی سادگی اور اوراظہار کی دلکشی کا امتزاج ان کے مضامین کی پہچان ہے۔ان کے ہاں نہ توسرسیداورحالی کی مقصدیت اورمذہبیت ملتی ہے نہ آقائے اردوپروفیسر محمد حسین آزاد کی شدت پسند تخیلیت۔وہ اپنے احساسات کے اظہار میں خارجی اثرات کوقبول نہیں کرتے۔وہ دنیاکواپنی نظرسے دیکھتے ہیں۔وہ اعلیٰ درجے کے انشاپرداز اورمضمون نگار توہیں مگراشعار کابکثرت استعمال ،عدم تکمیل اورفکرانگیز تشنگی کامعدوم ہونانہیں انشائیہ نگاروں میں شمار کرنے سے روکتاہے۔

رومانوی تحریک کاترجمان سرشیخ عبدالقادر کارسالہ" مخزن"اورجسٹس شاو دین ہمایوں کا مجلہ "ہمایوں" تھے۔علامہ اقبال ، ابوالکلام آزاد،سجادحیدر یلدرم،آغاشاعر قزلباش،ظفرعلی خاں مرزا محمد سعید،خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ،مہدی افادی،بشیراحمد،خلیقی دہلوی ،اختر شیرانی، عبدالعزیز فلک پیما، لطیف الدین احمد،خواجہ حسن نظامی اور مدیرِ" مخزن "شیخ عبدالقادر کے نام اہم ہیں۔ان مشاہیر میں سجادحیدریلدرم، ابوالکلام آزاد ،مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی نے ایسے مضامین لکھے جن میں صنفِ انشائیہ کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جو ادباء مغربی لائٹ ایسے سے متاثر ہوئے ان میں سجاد حیدر یلدرم کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے ۔وہ اپنے احساسات رنگین بنا کر پیش کرتے ہیں۔ان کی نگاہیں حسن کی متلاشی رہتی ہیں اور قلم اس حسن کی تصویر کو کاغذ پر پیش کرنے کے لیے بیتاب۔ حسنِ فطرت کا ذکر ہو یا جنسِ لطیف کا، کسی کے مرنے پر اظہارِ افسوس ہو یا کسی انقلابی سماجی تغیر پر اظہارِ مسرت، یلدرم الفاظ کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ یلدرم کا اسلوب جاندار و موثر اور مزاج شاعرانہ تھا۔انہوں نے نثر میں شاعری کی۔انہیں ترکی زبان کی نفاست اور تخلیقات میں خیالات کی رعنائی عزیز تھی۔اس لیے انہوں نے اردو میں بھی وہی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اردو میں نئے اسلوب کا اضافہ ہو اور اس کا حسن نکھر جائے۔اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ ان کے مضامین ''چاندی کی کیفیت، بھولی بسری یادیں، حضرتِ دل کی سوانح عمری اور چڑیا چڑے کی کہانی وغیرہ میں جذبہ اور خیال کی آزادانہ ترنگیں مختلف صورتیں اختیار کیے ہوئے ہیں جو دلکش بھی ہیں اور حسین بھی۔ان کے مضامین تہہ داری، معنوت اور رنگیں مزاجی کا آئینہ دار ہیں۔ان میں منطقی طریقہ اختیار کیے بغیر اپنی بات کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ان سارے محاسن کے باوجود یلدرم کی تحریریں انشائیے کی تعریف پر پورا نہیں اترتیں جس کی بڑی وجہ ان کے اسلوب کی ہیجان انگیزی ہے۔ کیونکہ انشائیے میں جذبات اور احساسات کا متوازن ہونا ضروری ہے ۔جب کہ ہیجان انگیزی کا بوجھ اٹھانے کے لیے ڈراما، شاعری، ناول اور ٹریجڈی وغیرہ جیسی اصناف موجود ہیں۔ یلدرم کا مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''ایک مکمل انشائیہ ہے۔ جس میں غیر رسمی اندازِ بیاں، اختصار، شگفتگی، شخصی نقطۂ نظر اور عدم تکمیل کے اوصاف پائے جاتے ہیں اگر یہ ترکی ادب کے انشائیے کا ترجمہ ہونے کے بجائے ان کی طبع زاد تخلیق ہوتی تو وہ اردو کے پہلے انشائیہ نگار کہلاتے ۔

یلدرم کے ہم عصر مہدی افادی کی رومانیت حواسِ انسانی کا زاویہ پیش کرتی ہے۔چنانچہ ان کے ہاں حواسِ خمسہ نظارۂ حسن پر برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔یلدرم کے ہاں لطافت کی بنا پر یہ جذبہ ہلکی لرزش پیدا کرتا ہے مگر مہدی افادی کے ہاں آتش فشاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔مہدی افادی کی تحریر کی خصوصیت اس کا جمالیاتی ذوق اور حسِ مزاح کی لطافت ہے۔وسیع نظری، جمالیات پرستی، زندہ دلی اور بے تکلفی ان کی تحریر کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ مہدی کے مقالات تنظیم اور علمی

رنگ کی وجہ سے انشائیہ نہیں کہلا سکتے البتہ ان کے خطوط انشائیے کے بہت قریب ہیں لیکن کیا کیجیے کہ وہ بھی مکتوب نگاری کی صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔

نیاز فتحپوری کو بھی بعض نقاد انشائیہ نگاروں میں شامل کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاعر ،ادیب،افسانہ نگار ، صاحبِ طرزانشاپرداز اور مضمون نگار ہیں۔وہ انشائے لطیف(ادبِ لطیف)کے نمائندہ ادیب ہیں۔ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔وہ سجادحیدریلدرم سے متاثرتھے۔انہوں نے سررابندرناتھ ٹیگور کی تصنیف "گیتانجلی" کااردوترجمہ" عرضِ نغمہ "کے نام سے کیا جس کی وجہ سے وہ ٹیگوریت سے بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور مضامین کے مجموعے" نگارستان "میں "برسات(ایک صحرانشیں کے نقطۂ نظر سے)" اور"ایک قافلۂ صحرا کودیکھ کر "کے نام سے انشائیہ نما مضامین بھی لکھے ۔ لیکن ان کے ایسے مضامین کی نوعیت تاثراتی ہے اوروہ پرتکلف اسلوب ،رومانیت اورجمالیت کے جوش وجذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ اختصار ، عدم تکمیل اور انکشافِ ذات جیسی انشائیے کی اہم خصوصیات سے بھی محروم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ مضامین انشائیوں میں نہیں گنے جاسکتے۔

پریم چند ترقی پسندافسانہ نگار اور ادیب تھے۔جس طرح رومانوی تحریک ،تحریکِ علی گڑھ کا رد عمل تھی اسی طرح ترقی پسند تحریک رومانوی تحریک کے ردعمل کے طور پر ابھری۔سید سجاد ظہیر،ڈاکٹر محمددین تاثیر ، ملک راج آنند،فیض احمد فیض ،صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اورپریم چندوغیرہ اس کے بانی تھے۔ترقی پسند تحریک نے رومانویت کے بجائے حقیقت نگاری کو ترقی دی۔پریم چند نے اردوافسانے کوداستانی ماحول سے نکال کراس کا رشتہ زندگی کے ساتھ قائم کر دیا ۔ پریم چند نے افسانوں کے علاوہ چندمضامین بھی لکھے جن میں انشائیہ کے تیور موجود ہیں۔ان کے مضمون"گالی "کوڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تصنیف" اردو کا انشائی ادب "میں شامل کیا ہے۔مگر چند بنیادی خصوصیات کی عدم تعمیل کی وجہ سے اس مضمون کو بھی انشائیہ کی ذیل میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

مولوی عزیز مرزا کی تحریر میں شگفتگی اور کسی حدتک قلمکار کی شخصیت کو نمایاں کرنے کی خوبیاں موجود ہیں۔ان کے ایک مضمون ''وغیرہ ''کاعنوان ہی اچھوتاہے۔اس میں جہانِ نو کی دریافت کی سعی موجود ہے۔جس میں معمولی چیزوں کے حوالے سے غیرمعمولی باتوں کی نقاب کشائی کی سعی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر وحیدقریشی نے اپنی تصنیف'اردو کا انشائی ادب ''میں اسے بھی شامل کیا ہے۔

ڈاکٹروحیدقریشی نے جن انشاء پر دازوں کو اپنی تصنیف میں انشائیہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے ان میں ایک نام سید احمددہلوی کا بھی ہے۔ سید صاحب معمولی معمولی باتوں پر نظررکھتے ہیں۔ روانی،شوخی ،شگفتگی،لفظی تصویرکشی اور جزئیات نگاری ان کی تحریر کی نمایاں خوبیاں ہیں۔''مفلسی ''ان کا ایسا مضمون ہے جو پہلی نظر میں انشائیہ ہی لگتا ہے مگر صنفِ انشائیہ اسے قبول کرنے میں متامل ہے۔

مولانا منشی محی الدین خلیقی دہلوی بھی ایک رومانی ادیب اورانشاپرداز تھے۔ان کی دنیا بے حدرنگین اورحقیقت کی تلخیوں سے ماورا ہے۔یہ دنیا اشاروں ،رنگوں اورلطافتوں کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ پہلے مضمون نگار ہیں جنہوں نے اپنے چند مضامین میں پہلی بار اپنی ذات کو ملوث کیا ہے۔حالانکہ اس دور میں مضمون نگاروں کو زبان وبیان کے نکھار کی خصوصیت کے باعث ہی انشائیہ نگار مان لیا جاتاتھا۔البتہ ان کامضمون'' درہ موت''خاصے کی چیز ہے۔جب کہ ان کامضمون ''حریصِ رقص ''میں انشائیے کی ۹۰ فیصدخصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن خلیقی دہلوی نے نہ تو شعوری طورپر انشائیہ لکھااور نہ ایک انشائیہ لکھنے پر وہ باقاعدہ انشائیہ نگار کہلا سکتے ہیں۔ سلطان حیدرجوش بھی معروف انشاپرداز ہیں۔ان کامیدان مزاح نگاری ہے لیکن ان کی مزاح نگاری میں گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور گیرائی بھی ۔ اکثر مزاح نگاروں کے برعکس ان کے مزاح میں فلسفیانہ عنصر بھی ہے اور شگفتگی و متانت بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں پر انشائیے کا گمان ہوتا ہے۔لیکن طنز کی شدید کاٹ کے باعث انہیں انشائیہ نگار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ سجاد انصاری رومانی تحریک کا ایک اہم انشاپرداز ہیں۔وہ پرانے بتوں کوتوڑکر نئے بت تراشتے

ہیں۔یلدرم اورمہدی افادی کے برعکس سجادانصار ی کے ہاں جذبہ زیرِ سطح رہتا ہے۔سجادانصاری کی رومانیت حواسِ خمسہ کو بیدار کرنے کے بجائے انسان کی چھٹی حس پر اثرانداز ہوتی ہے۔سجاد کامنفرد اسلوب لطافت، رنگینی اورخیال آرائی سے آراستہ ہے۔ان کے مضامین کی خاص خوبی جذباتیت،حسن پرستی،آزادروی اور فلسفیانہ فکر ہے۔ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں عالمِ خیال کی ایک دنیا پوشیدو ہے۔ان کی تحریروں میں ان کے دل و دماغ بعینہ جھلکتے ہیں۔ان کی شخصیت کوان کے فن سے جدانہیں کیاجاسکتا۔وہ اپنے محسوسات کوانتہائی بے باکی کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔خیالات کی گہرائی، مشاہدات کی وسعت اورانداز بیاں کی ندرت ان کی انشاء کی نمایاں خصوصیات ہیں۔سجاد کے ہاں انشائیے کی چند خصوصیات اختصار،جامعیت، ندرتِ خیال،فلسفیانہ اندازِ فکر اور فکری تنوع نمایاں ہیں جو ان کے مضامین کو انشائیہ نمابناتی ہیں جوان کے مجموعۂ مضامین''محشرِ خیال ''میں دکھائی دیتا ہے۔یہ صفات انہیں انشائیہ نگاروں کی صف میں تونہیں لا کھڑاکرسکتیں مگر ان کے صاحبِ طرز انشاپرداز ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ عبدالعزیزفلک پیمائی رومانیت ماضی سے منسلک ہے۔ان کے خیالات میں گہرائی اورگیرائی ہے۔ان کی تمام تخلیقات پر ادبِ لطیف کااطلاق نہیں ہوتا۔انہوں نے ادب کوعام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ان کاخیلا تھا کہ ادب پاکیزہ ہواوراس کاکوئی مقصد ہو۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلک پیما کی تحریر میں افادی اورعوامی ادبِ لطیف ہیں۔ان کی زبان سادہ وسلیس ہے۔اس لحاظ سے ان کامرتبہ ادبِ لطیف کے مصنفین میں بالکل ہی منفردہوجاتا ہے۔ان کی تحریر میں فلسفیانہ رنگ اورطنزومزاح گھل مل جاتے ہیں ۔تشبیہ،استعارے اور زبان کی شوخی کے ساتھ فلسفیانہ انداز کی آمیزش نے ان کی مزاح نگاری کے اسلو ب کو انفرادیت عطا کی ہے۔ان کی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں میں اعتدال ہے۔وہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہیں مگر قہقہے لگانے پر مجبور نہیں کرتے اور یہ انشا ئیہ کی خوبی ہے۔وہ زندگی کے مسلمہ اصولوں کو ایک انشائیہ نگارکی طرح منفرد زاویے سے دیکھتے ہیں مگر طنز کی فراوانی،عدم تکمیلیت اور انکشافِ ذات کے فقدان کی وجہ سے وہ مضمون نگار ہی کہلاتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کی نثر اپنے اندر نہ صرف ادبی شان لیے ہوئے ہے بلکہ خطابت کاعنصر بھی اس کاخا

صہ ہے۔وہ خطیب بھی ہیں اور ادیب بھی۔و ہ مفسر ،مدبر،سیاستدان،لیڈر،مضمون نگاراورصاحبِ طرزانشاپرداز بھی۔انہوں نے ان سب میدانوں میں اپنی انفرادیت قائم کی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ عام سے مضمون کو اپنی جادوبیانی سے نہایت دلکش اور جاذبِ توجہ بنادیتے ہیں۔ سید سلمان ندوی نے ان کی نثر کو سحرِ جلال کہا ہے۔اگرچہ ان کی نثر علمی تبحر اور ادبیت کا حسین امتزاج ہے لیکن غبارِ خاطر میں انہوں نے جگہ جگہ لطیف جذبات واحساسات کا اظہاراس خوبصورتی سے کیاہے کہ وہ بالکل انشائیہ لگتے ہیں۔ غبارِ خاطر مولانا کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران میں نواب صدر یارجنگ حبیب الرحمان شیروانی کو لکھے ۔قیدِافرنگ کے ان ایام میں انہیں شورشِ سیاست سے الگ کرکے گوشۂِ تنہائی میں ڈال دیاگیا۔خط وکتابت پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ان ایام میں ان کی خود کلامی نے ان سے انشائیے لکھوائے جن میں انکشافِ ذات کاادبی اظہار بھی ہے اور انشائیے کا اسلوب بھی ۔زاغ وبلبل،چڑیاچڑے کی کہانی اور بالخصوص چائے کے بارے میں ان کی گفتگو کا پیراگراف انشائیے کی بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں مگر انشائیے کے مجموعی مزاج کی عدم مطابقت اور صنفِ مکتوب نگاری سے ہونے کے باعث یہ انشائیے نہیں کہلاسکتے۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار بھی اردو کے نمایاں انشاپردازوں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت صوفی،پیراورعالمِ دین بھی تھے اور ادیب ونقاد بھی۔ان کے مضامین شگفتگی اور زندہ دلی کی مثال ہیں۔ان کا ادبی ذوق نہایت سلجھا ہوا،سنجیدو اور متین تھا۔ان کی متصوفانہ نگاہیں،عمیق مشاہدہ اور کوثروتسنیم سے دھلی دھلائی ٹکسالی زبان ان کے مضامین کی نمایاں خصوصیات ہیں۔انہوں نے اپنے مضامین کی اساس خداپرستی اورانسانی ہمدردی پر رکھی۔ وہ اس ڈھنگ سے بات کرتے ہیں کہ ان کاہرلفظ دل میں اترتا محسوس ہوتاہے۔اگر انہیں اپنی کسی تحریر کا رکاکت میں گرنے کا ڈر ہوتا تواسے متانت کی چادر اوڑھا دیتے۔وہ زندہ دل صوفی ،ادیب اورفلسفی تھے۔انہوں نے نہ صرف ڈائری لکھنے اور اسے شائع کرنے کی طرح ڈالی بلکہ چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کوفنکارانہ چابک دستی کے ساتھ انکشافِ ذات کاوسیلہ بنا کر اسے انشائیہ کی کئی خصوصیات کا حامل بنا دیا۔ گو کہ مچھر،دیاسلائی

، جھینگر کا جنازہ،الو وغیرہ جیسے ان کے مضامین طنزومزاح کی افراط،خارجیت ،غیرانشائی اسلوب کی وجہ سے انشائیے کے معیار پر پورے نہیں اترتے لیکن ان کی تحریریں ان کی انشائیہ نگاری کی صلاحیت کوضرور بے نقاب کرتی ہیں۔

مرزافرحت اللہ بیگ کا مزاج اور انکا اسلوب دونوں ان کی شخصیت کے ترجمان ہیں۔زندہ دلی کاجوہرانہیں ورثے میں ملاتھا ۔دہلوی ہونے کی وجہ سے وہ دہلی کے روزمرہ اور محاورہ پرقدرت رکھتے تھے۔ان دوچیزوں نے ان کے تخیل کی جودت اور عصری رجحانات سے مل کرمنفرداسلوبِ نگارش کی صورت اختیار کرلی تھی۔ قدرت نے فرحت کو ذہانت کے ساتھ ساتھ ظرافت اورزندہ دلی کے اوصاف سے بھی نوازاتھا۔ان کی مزاح وظرافت بالکل فطری معلوم ہوتی ہے ۔ان کے مضامین ان کی شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے ذاتی تجربات اورخیالات کابڑی جرأت سے اظہارکیا۔ماحول کے تقاضے ، تعلقات کی مصلحتیں اورکاروبارکی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کرفرحت نے اپنی ذات اورشخصیت کابھرپوراستعمال کیا۔ان کے مزاح میں انشائیوں کی دلبستگی اورشعر کی جامعیت ہے۔ان کابے تکلف انداز ان کی تحریروں کاجمال ہے۔ فرحت کے ہاں انشائیے کے دو امتیازی اوصاف" شگفتہ اندازِ تحریر "اور"موضوع سے گہراتعلق ہونا"توپائے جاتے ہیں مگر"بے ربطی" ، اور"ناتمامیت"جو انشائیہ کے بنیادی ا وصاف ہیں کی عدم دستیابی اور مزاح وظرافت کاغلبہ انہیں انشائیہ نگار منوانے میں رکاوٹ ہے۔

رشید احمدصدیقی اپنی ادبی شخصیت،منفرداسلوب،اپنی وقیع،سنجیدو اور خیال انگیزظرافت ، باکمال مرقع نگاری اورفقرہ بازی کی وجہ سے اردوادب پر ثبت ہونے والا ایک لازوال اورانمٹ نقش ہیں۔انہوں نے" اودھ پنچ" کی فقرہ بازی کوایک نیاروپ عطاکیا۔ان کا مزاح قاری کو قہقہے لگانے پر مجبورکرنے کے بجائے غوروفکرکرنے کی دعوت دیتاہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کو پھبتی اورضلع جگت کے بجائے فلسفیانہ استدلال اوربذلہ سنجی سے سنوارا۔ آزادتلازمۂ خیال اور موضوع کے انوکھے پہلوؤں کی تلاش کاعمل اوربات سے بات پیدا کرنے کاعمل انہیں ایک انشائیہ نگار کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ان کی تحریروں میں مقامیت،خارجی شخصیت اورچندمخصوص سیاسی،،سماجی

ماورمذہبی رجحانات یوں توعام ہیں لیکن بعض اوقات انہوں نے ان روایات سے ہٹ کرچندایسے مضامین بھی لکھے ہیں جواپنے مزاج اورفضا کی وجہ سے انشائیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین" ارہر کا کھیت "اور "چارپائی "کوایک بالکل نئی معنویت عطاکی ہے۔مگر صاحبِ طرز انشاء پرداز ہوتے ہوئے بھی رشیداحمدصدیقی طنز ومزاح کے غلبے،انکشافِ ذات نہ ہونے اورعدم تکمیلیت سے محرومی کے باعث وہ انشائیہ نگاروں میں شمار نہیں کیے جاسکتے۔

ظرافت ایک تہذیبی سرگرمی کے طورپر وجود میں آتی ہے۔اوریہی ظرافت کااعلیٰ معیار بھی ہے۔گویالفظی کرتب بازی ، پھکڑپن اورابتذال سے بلندترسطح پر بہترطنزومزاح تخلیق ہوتاہے۔پطرس بخاری کی طنزومزاح نگاری اودھ پنچ کی ایک بہتر اور مہذب صورت ہے۔کیوں کہ اس میں اودھ پنچ والاتمسخر،بذلہ سنجی، پھکڑپن اورابتذال نہیں لیکن ہیجان انگیزی ضرور ہے۔وہ لفظو ں کے بازی گرنہیں۔ان کاایک ایک جملہ جامع اورہمہ گیرہے۔تازگی اورشگفتگی ان کے اندازِ بیاں کاحسن ہے۔ انہوں نے نہ صرف علم وادب بلکہ سماج وسیاست پربھی بڑے لطیف حملے کیے ہیں۔پطرس کے قہقہوں میں تنقید اوران کی طنز میں شگفتگی ہے۔اس لیے معمولی سےموضوع بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کرغیرمعمولی بن جاتاہے۔جب کہ انشائیہ پطرس کے مزاح کی سطح سے ارفع تر ایک اور سطح کوطلب کرتا ہے۔ انشائیہ طنزومزاح کی طرح ہیجان خیز نہیں ہوتا بلکہ سکون آور ہوتا ہے۔ ان کے مضامین"کتے "،" سویرے جو کل آنکھ میری کھلی "،"بچے "وغیرہ میں انشائیے کے عناصرتوموجود ہیں مگر یہ مضامین انکشافِ ذات کی خصوصیت سے محروم اور طنزومزاح سے بھرپور ہیں۔

کنہیالال کپور

کر شن چندر ترقی پسندافسانہ نگار،ناول نگاراور طنزومزاح نگار تھے۔ابتدائی دور کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں ان کااسلوب انشائیے کے اسلوب کے قریب تر تھا۔بعد میں ترقی پسندتحریک کے زیرِاثر ان کی تحریروں میں مقصدیت درآئی تھی ۔ان کی اس دور کی تصنیف"ہوائی قلعے "کے

مضامین ادبِ لطیف کی شعریت اورانشائی ادب کے کامیاب نمونے پیش کرتے ہیں۔ہوائی قلعے میں شامل ان کے مضامین فکروفن سے تعلق رکھنے والے بنیادی عناصر آزادی فکر، تنوع، تخیل آفرینی،ندرتِ خیال اور انشائی اسلوب کے حامل ہیں۔ کرشن چندر نے ''بدصورتی''، ''رونا''، ''آنکھیں'' اور''ہوائی قلعے ''مضامین لکھ کر انشائیے کے لیے زمین تیارکرنے والے ممتاز ادیب ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک کی مقصدیت اورطنزومزاح کے غلبے نے انہیں انشائیہ نگار نہ بننے دیا۔ ''ترنگ'' سید علی اکبر قاضد کے مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں اختراورینوی نے انشائیہ سے موسوم کیاجبکہ خود انہوں نے اس کے دیباچہ میں انشائیے کی جو تعریف کی اکبر علی قاصد کے مضامین پر اس کااطلاق نہیں ہوتا۔اس لیے سید علی اکبر قاصد کوانشائیہ نگاروں میں شامل نہیں کیاجاسکتا۔ان کی تحریروں میں طنزیہ مضامین کاوہی روایتی اندازاورزندگی کی ناہمواریوں سے ظرافت کی تخلیق کی وہی طرز کارفرمانظر آتی ہے جو مدت سے چلی آرہی تھی۔

مشتاق احمدیوسفی کو بھی بعض نقاد انشائیہ نگاروں میں شامل کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ وہ صرف اور صرف طنزومزاح نگار ہیں۔اور اس فن میں وہ اپنی مثالؔ پ ہیں۔انہوں نے طنزومزاح کاہر ہتھیار استعمال کیا اور کامیابی سے استعمال کیا۔ان کے لکھے گئے مضامین میں کہیں کہیں انشائیے کی جھلک نظرآتی ہے۔خصوصاً جب وہ بات سے بات نکالتے ہیں یاکسی موضوع کاکوئی چونکادینے والاپہلو سامنے لاکر قاری کو پرمسرت حیرت سے دوچار کرتے ہیں تووہ انشائیہ نگار محسوس ہوتے ہیں ۔اس کے باوجود وہ اول تاآخر طنزوظرافت نگار ہی ثابت ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین اردو طنزومزاح کا ایک معتبرنام ہے۔وہ زندگی سے قریب اورزندگی کی تلخیوں اورشادمانیوں سے واقف ہیں۔ان کاتجربہ تازہ بتازہ ہے۔ اورمشاہدہ گہرا۔وہ اپنے مشاہدہ اور تجربے کوفکروخیال کی بھٹی میں تپاتے ہیں اوراس کے نتیجہ میں جوکچھ بھی حاصل ہوتاہے اسے ہنسی خوشی پیش کردیتے ہیں۔ ان میں آہوں کوچھپانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجودہے۔ ان کے مضامین میں انشائیے کی کئی طرح کی خصوصیات جیسے معنیٰ آفرینی،بے ربطی اور '' میں ''کے صیغے کا استعمال وغیرہ پائی جاتی ہیں۔لیکن ان کی'' میں ‘میں انکشافِ ذات نہیں ہے اورنہ ان کے مضامین

طنزومزاح کے غلبے سے آزادہیں ۔نیزان کے ہاں شگفتگی او ر متانت بھی انشائیے والی نہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اردو انشائیہ انگریزی ایسے سے لیاگیاہے۔ البتہ اردو انشائیہ نگاری پر فارسی اور اردو انشاء نگاری اور انشاء پردازی کے اثرات نے اسے کئی اضافی خصوصیات کاحامل بنادیاہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ انشائیہ اسی تحریر کو کہناجائز اور درست ہو گاجوانشائیہ کے بانی مانتین کے تصورِ انشائیہ کے مطابق ہوگا۔اور انگریزی کا وہ ایسے جو لائٹ بھی ہو اور پرسنل بھی وہی انشائیہ قرارپائے گا۔ آیئے اسی اصول کے تحت معاصراردو انشاء نگاروں اورانشاپردازوں کی تحریروں میں انشائیہ نگاری کا جائزہ لیں۔

(ب)معاصراردوانشائیہ نگار

اردوانشائیہ کاآغازصنفِ ادب کی حیثیت سےبیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ڈاکٹر وزیراغا کے ہاتھوں ہوا۔پھراس تحریک میں مشتاق قمر اور جمیل آذر شامل ہوئے۔اوریوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک کارواں چل پڑاجس میں انورسدید،غلام جیلانی اصغر،سلیم آغاقزلباش،کامل القادری،احمدجمال پاشا،رام لعل نابھوی،اکبرحمیدی، بشیر سیفی،محمداسداللہ ،سلمان بٹ،حامدبرگی،انجم انصار، خالدصدیقی، ارشد میر،جان کاشمیری وغیرہ جیسے بہترین انشائیہ نگار شامل ہیں۔دوسری طرف مشکورحسین یاد اورنظیرصدیقی وغیرہ ہیں جن کاتصورِ انشائیہ دبستانِ سرگودھا کے تصور سے مختلف ہے۔ دبستانِ سرگودھا سے وابستہ انشائیہ نگاران مشتاق قمراور جمیل آذر کی انشائیہ نگاری کافنی ،موضوعاتی اور اسلوبیاتی جائزہ لینے سے قبل وزیرآغا کی انشائیہ تحریک سے اتفاق رکھنے والے اور ان سے اختلاف کرنے والے انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کامختصرفنی وموضوعاتی جائزہ لیناضروری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جس شخص نے انشائیہ کو اردو میں ایک صنف کی حیثیت سے اس کاحقیقی مقام دلوایا وہ ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ آپ سے پہلے بھی اردو میں انشائیے کا وجود تھا اور یہ وجود عبدالحلیم شرر لکھنوی سے لے کر سرسید احمد خان، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی،

محمد حسین آزاد وغیرہ سے ہوتا ہوا مجتبٰی حسین تک اپنی جھلک دکھاتا آرہا تھا لیکن انشائیے کے نام سے ایک الگ صنف کی صورت میں اس کے پاؤں جمانے کی تگ و دو وزیر آغا نے کی۔ اگرچہ وزیر آغا اردو انشائیہ کے موجد نہیں لیکن ہر پہلو سے بابائے انشائیہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق سے پہلے اردو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی مگر مولوی عبدالحق کی دن رات محنت نے انہیں بابائے اردو بنا دیا۔ جب کہ انشائیہ کے تو پاؤں ہی وزیر آغا کی سعی سے بر صغیر کی زمیں پر لگے۔ اس لئے انہیں بابائے انشائیہ کہنا بجا ہے۔ انشائیہ پر وزیر آغا کا یہ احسان ہے کہ نہ صرف انہوں نے خود انشائیہ نگاری کی بلکہ انشائیے کے خدوخال واضح کرنے کے لیے کئی تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ لفظ انشائیہ کو اس کے صحیح معنوں اور تعریف کے ساتھ اردومیں متعارف کروانے کا سہرا اختر اور نیوی کے سر ہے۔ لیکن اختراورنیوی نے جس مجموعے" ترنگ "کے مقدمے میں یہ نام تجویز کیا ۔ نہ تو اس کتاب میں انشائیے شامل تھے اور نہ ہی اس کے بعد اختر اورنیوی نے خود یا کسی اور نے اس صنف کو ترقی دینے کی کوشش کی بلکہ مضمون اور انشائیہ ایک دوسرے میں ہی مدغم رہے۔ کہیں انشائیے کے نقوش کم نظر آئےتو کہیں زیادہ لیکن انشائیے کی تحریک چلانے اور انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ سامنے لانے کا کام وزیر آغا کے ہاتھوں ہی سرانجام پایا۔ یہ وزیر آغا کی اپنی تخلیقی توانائی ، تنقیدی شعور اور مخلصانہ سعی کا نتیجہ تھا کہ انشائیے نے اردو ادب میں ایک علیحدہ صنف کی حیثیت پائی۔ اگرچہ انہوں نے اپنا پہلا انشائیہ ادب لطیف لاہور کے اگست 1955 کے شمارے میں "گرمی کی آغوش میں "کے عنوان سے لکھا۔ جب وہ خود اس صنف کے لیے کسی منفرد نام کی تلاش میں تھے۔ لیکن ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ" خیال پارے "کے نام سے 1961 میں منظرِ عام پر آیا۔

یہ انشائیہ کی خوش قسمتی تھی کہ وزیر آغا خود" اوراق "کے نام سے ایک موقر اور ممتاز مجلہ شائع کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اسی رسالے کو انشائیہ کی تحریک کے لئے پلیٹ فارم کے طور پر استعما ل کیا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے دوست مشتاق قمر کو انشائیہ لکھنے کی ترغیب دی

جو ناول نگار، افسانہ نگار، مضمون نگار اور نقاد بھی تھے۔پھر جمیل آذر آئے اور پھر ایک لمبی قطار لگ گئی جس میں شامل انشائیہ نگاروں نےستارے بن کرانشائیے کے آسمان کو جگمگادیا۔

وزیر آغا بنیادی طور پر نقاد تھے لہٰذا انہوں نے انشائیے کو متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اس کے خدوخال واضح کرنے کے لئے تنقیدی مضامین بھی لکھے اور تنقیدی مباحث کو بھی تحریک دی۔ پس اردو انشائیہ نے وزیر آغا کی تنقیدی اور تخلیقی دونوں طرح کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا ہے۔ وزیر آغا کے لیے انشائیے کی مکمل تعریف بیان کرنا تو ابھی ممکن نہیں ہوا لیکن آپ نے انشائیے کی جو تعریف کی ہے وہ بڑی حد تک درست ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> "انشائیہ اس صنفِ نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طوراپنی گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدارکووجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"[6]

وزیر آغا نے تشبیہات و استعارات سے مزین شاعرانہ حسن اور احساس بھی ان کےاسلوب کی دلکشی فزوں کرتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> "سیدھی سڑک تو ایک لائن کی طرح ہے جو ازل اور ابد کے درمیان بے حس پڑی ہے۔ پہلے سنگِ میل سے آخری سنگِ میل تک سیدھی سڑک ایک سپاٹ، بے رنگ اور بے جان سی شے ہے جس پر سفر کرنے والا خود بھی اکتاہٹ اور بدمزگی کا شکار ہو کر دم توڑ دیتا ہے لیکن جونہی یہ سڑک ہر میل پر مڑنا شروع ہوتی ہے تو اس میں جان پڑجاتی ہے۔ سڑک کے لئے ہر موڑ ایک دھڑکن ہے اور دھڑکنوں کا یہ سلسلہ جس قدر تیز اور پیدار ہوگا سڑک اسی قدر جاندار، جاذب نظر اور جیتی جاگتی نظر آئے گی۔ ندی کے حسن کا راز بھی اسی میں ہے اور زندگی۔۔۔زندگی میں اگرکوئی موڑ نہ ہو تو کس کام کی ہے۔[7]

مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں تشبیہ و استعارہ استعمال ہوئے ہیں وہاں سڑک کے موڑ کے موضوع کے ضمن میں زندگی کے موضوع پر بھی گفتگو کرلی گئی ہے، دلچسپ انداز میں فکر انگیزی اور خیال افروزی کا کام سرانجام دے دیا گیا ہے، موضوع کے انوکھے رخ کو بھی سامنے لایا گیا ہے اور دعوتِ فکر بھی دے دی گئی ہے ۔ وزیر آغا کے انشائیوں کی تمام خوبیاں انشائیے کی تکنیک اور فنی لوازمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس کی بنیاد مانتین نے رکھی تھی۔ وزیر آغا نے نہ صرف اشیاء کو موضوعِ تحریر بنایا ہے بلکہ تہذیب اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے اعمال، رسوم اور رواج بھی بطورِ موضوع لے کر زمین سے وابستگی کو قائم رکھا ہے۔ وزیر آغا کے انشائیے ہوں یا شاعری یا دیگر نثری کام وہ مٹی زمین اور زمینی ماحول سے اپنا رشتہ ہمیشہ قائم رکھتے ہیں

انکشافِ ذات اور اظہارِ شخصیت انشائیہ کی روح ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ شخصیت کا اظہار اور ذات کا انکشاف بلاواسطہ (یعنی متکلم کے صیغے میں) بھی کرتے ہیں اور بالواسطہ (غائب یاحاضر کے صیغوں میں بھی) ۔وزیر آغا صاحب خاندانی طور پر جاگیردار اور زمیندار فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی زمینداری سے تعلق تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے سانسوں میں ساری زندگی اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہی بسی رہی۔ وہ اپنی ثقافت سے رشتہ نہ توڑ پائے اور ان پر اپنی تہذیب کی چھاپ کبھی کم نہ ہوئی۔جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ وزیر آغا کو اپنی زمین اور ثقافت سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ ان کے انشائیوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ موسمی تہوار، ہری بھری فصلیں اور جھومتے پیڑ ان کے انشائیوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ایک انشائیے" بسنت "میں لکھتے ہیں:

> "بسنت سرسوں کا تہوار ہے۔ یہ سرسوں کے کروڑوں ، اربوں پھولوں کا میلہ ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسوں کا رنگ صرف کھیتوں تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ کھیتوں کی مینڈھ پر چلتی ہوئی دوشیزہ کے عارضوں میں بھی جھلکتا ہے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسانوں کے جسموں سے بھی پھوٹتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ آسمان کے آئینے میں منعکس ہونے لگتا ہے۔"[8]

وزیر آغا کے موضوعات تنوع اور بوقلمونی سے معمور ہیں۔ انہوں نے ایک طرف بے جان اشیاء اور وہ بھی معمولی جیسے چھکڑا، لحاف، بسنت، دیوار، حقہ ، کھڑکی، ٹھنڈا برف ہاتھ، ہینڈ بیگ اور فٹ پاتھ دوسری طرف مجرد اشیاء جیسے تنہائی ، کچھ مسکراہٹ کے بارے میں اور تیسری طرف جاندار اشیاء مثلا میرے بچپن کا دوست، طوطا پالنا اور چوتھی طرف چوری سے یاری تک ،چیخنا، جہاں کوئی نہ ہو، میری چالیسویں سالگرہ، کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں، یہ معصوم لوگ اور معافی مانگنا وغیرہ جیسے جذبات، احساسات کے مرقع انشائیے لکھے۔ ان انشائیوں میں وزیر آغا کا گہرا مشاہدہ ، زندگی سے ربط اور تخلیقی توانائی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اندھیروں میں پڑی غیر مرئی اشیاء کو مظہر بنا رہے ہیں۔

وزیر آغا بسااوقات اپنے بتائے ہوئے اصولوں پرخودبھی قائم نہیں رہتے۔ایک طرف شگفتگی پر اصراراوردوسری طرف خوف ودہشت کے منڈلاتے ہوئے سائے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے

> "ہر چیز ایک غیرفانی ترتیب میں ڈوبی ہوئی کسی صوفیانہ استغراق میں گم زمان و مکان کی سرحد کو عبور کرچکی ہے۔ مجھے کمرے میں آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہ ترتیب سلجھاؤ، یہ تغیر ناآشنا کیفیت ، موت کے سے انجماد کا نقشہ پیش کرتی ہے اور میرے احساسات بھی پا بہ زنجیر ہونے لگتے ہیں۔ میں خود بھی کمرے کا ایک حقیر سا بے روح جزو ہوکر رہ جاتا ہوں۔"[9]

وزیر آغانےانشائیے کے جس محل کی تعمیر کی اور تخت پر بیٹھے اس کی بنیاد رکھنے والوں میں ممتاز مفتی، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، غلام علی چودھری، حسنین کاظمی، امجد حسین وغیرہ شامل ہیں ۔ وزیر آغا نے اس سلسلے میں دو کام کیے۔ پہلا یہ کہ ان تحریروں کو انشائیہ کا نام عطا کیا اور دوسرا یہ کہ انگریزی انشائیہ کا رشتہ اپنی دھرتی سے جوڑ کر اس کے فن اور تکنیک میں اجتہادی کارنامہ سرانجام دیا۔ وزیر آغا کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ موضوع کے نئے گوشے سامنے لانے کے لیے اپنے موضوع اور الفاظ کو الٹنے پلٹنے کی بجائے اپنے مشاہدے کے رخ اور اپنی فکر کے

زاویے کوبدل دیتے ہیں ۔ بعض حضرات طنز اور مزاح کو بالکل ہی ممنوع قرار دیتے ہیں لیکن وزیر آغا اسے ممنوع قرار نہیں دیتے بلکہ طنز کو سبک اور دھیما اور مزاح کو لطیف اور ہلکا پھلکا بنا کر انشائیے کو شگفتگی اور تازہ کاری عطا کرتے ہیں۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی اور خیال افروزی کی خصوصیات بھی نمایاں نظر اتی ہیں۔ انکی یہ خصوصیات" خیال پارے "اور" دوسرا کنارہ "کے مقابلے میں" چوری سے یاری تک " اور" سمندر اگر میرے اندر گرے "کے مجموعوں میں زیادہ توانا نظر آتی ہے۔ جبکہ خیال پارے میں طزو مزاح کا غلبہ ہےبالخصوص " پنسل کی معیت میں "بالکل نظیر صدیقی کا انشائیہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس بات کو شاید وزیر آغا نے بھی محسوس کرلیا تھا اسی لئے" خیال پارے " کی دوسری اشاعت میں اسے شامل کرنے سے اجتناب کیا گیا۔وزیر آغا کی انشائیہ نگاری مسلسل ارتقا پذیر رہی یہاں تک کہ" دوسرا کنارہ "میں وہ اپنے فن کی معراج پر نظر آنے لگتے ہیں۔ اس مجموعے میں ایک اور خصوصیت مکمل طور پر پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے" کفایتِ لفظی "یعنی کم سے کم الفاظ میں بات مکمل کردینا۔ جب ہم ان کے آخری مجموعے" سمندر اگراگر میرے اندر گرے "کو پڑھ لیتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے اٹھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ اردو انشائیہ کے محسن ہیں اور انہیں" بابائے انشائیہ "کالقب دینابجاہے۔

مشکور حسین یاد

مشکور حسین یاد بھی جدید انشائیہ کے بانیوں میں شامل ہیں۔ البتہ انشائیہ میں ان کا تصور اور طریق کار جدید انشائیہ اور مضمون کا امتزاج ہےجس پر کبھی طنزومزاح غالب آجاتا ہے کبھی سنجیدگی جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہوجاتا ہے کہ یہ سنجیدہ مضمون ہے یا طنزیہ یا انشائیہ۔ مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی میں فرق یہ ہے کہ نظیر صدیقی صرف طنزیہ انشائیہ لکھتے ہیں جبکہ یاد سنجیدہ انشائیہ لکھتے ہیں تو وہ سنجیدہ مضمون بن جاتا ہے اور طنزیہ انشائیہ لکھتے ہیں تو وہ طنزیہ مضمون بن کے رہ جاتا ہے۔ صرف چند ایسے انشائیے ہیں جو صنف انشائیہ کے زمرے میں داخل ہیں۔

اس لئے مشکور حسین یاد کو انشائیہ نگاروں میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ نیز ان کے ہاں انشائیہ کا تصور بدلتا رہتا ہے کبھی وہ اسے ام الاصناف کہہ کر اس کی انفرادیت ہی ختم کردیتے ہیں اور کبھی اردو ادب میں انشائیے کے وجود سے ایسے ہی انکار کر دیتے ہیں جس طرح کلیم الدین احمد اردو شاعری کی بعض اصناف کے وجود کو عدم میں بھیج دیتے ہیں۔ مشکور حسین یاد کا انشائیہ کبھی بیکن کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور بیکن Essay کا موجد ہے نہ کہ Essai (انگریزی کا پرسنل لائٹ ایسے)کا ، اور کبھی برٹرینڈرسل کے مضامین کے زیادہ قریب جو کہ طنز نگار ہے۔ مشکور حسین یاد انشائیے کی تعریف میں کبھی بالکل درست سمت میں بھی رواں دواں ہوتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اردو اور اقبالیات کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں جو بعد میں انتخاب انشائیہ نمبر کے نام سے شائع ہوا۔جس میں انشائیے میں شگفتگی سے کیا مراد ہے؟ کے موضوع کو بہت احسن طریقے سے بیان کیا اور بھول کے استعارے کو بنیاد بنا دیا کہ تبسم زیرِ لب کی حقیقت آشکار کردی۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں" تجربہ اور ناتجربہ کاری"،" ناک پکڑنے کا عمل "اور" لمحے کا دوام "انشائیوں میں خیال آرائی اور نکتہ آفرینی کے عناصر بہت نمایاں ہیں اس کے علاوہ" صبح "اور" لے سانس بھی آہستہ "میں بھی انشائی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے انشائیے" صبح "کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے :

> وقت کسی نے نہیں دیکھا، کسی نے نہیں پایا، لیکن صبح کی بدولت ہمیں اس کے صد ہا روپ نظر آجاتے ہیں۔ صبح نہ ہوتی تو وقت خلاؤں میں مارا مارا پھرتا۔ وقت صبح کے دامن میں پروان چڑھ رہا ہے۔ صبح کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس کی آغوش میں اندھیرا بھی ہے اور اجالا بھی۔ یہاں تلخیوں کو بھی پناہ ملتی ہے اور حلاوتوں کو بھی۔ اس کے سائے میں پھول اور کانٹے دونوں پرورش پاتے ہیں۔ صبح مٹ جائے تو زندگی کی رنگارنگی ختم ہوجائے۔ تضاد کا سارا لطف صبح سے قائم ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز سوناہویانہ ہوچمک اپنی جگہ ایک قدرومنزلت رکھتی ہے۔[10]

مشکور حسین یاد موضوع کو چھوڑتے نہیں لیکن اسے ڈھیلا ضرور چھوڑدیتے ہیں۔ وہ موضوع کو نئے انداز میں دیکھتے۔ نکتہ آفرینی اور مخفی مفاہیم تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے ایک انشائیے" تجربہ اور ناتجربہ کاری" کا اقتباس دیکھیے۔

> تجربہ سے پہلے انسان یگانگت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کائنات اس کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے نہیں کہ کائنات کوئی مٹھی میں آنے والی شے ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ اپنی مٹھی اور کائنات کو دو الگ چیزیں تصور نہیں کرتا۔ نہ آگ اسے جلاتی ہے نہ پانی اسے ڈبوتا ہے۔ سب تک پہنچنا اور سب کو اپنے تک لے آنا اپنے نہایت سہل اور آسان نظر آتا ہے۔ اس کے راستے میں دیواریں حائل نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی ہیں تو اسے یقین ہوتا ہے کہ جب وہ سفر کا آغاز کرے گا یہ خود بخود اس کے لئے راستہ بنادیں گی۔ دراصل نا تجربہ کاری کی فضا دوستی کی فضا ہے۔ اس میں انسان کو سب اپنے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی غیر نظر نہیں آتا۔ تجربہ سب سے پہلے اسی دوستی کی فضا کو مجروح کرتا ہے۔ نفع اور نقصان اور اپنے اور پرائے کی تمیز اس کا اولین عطیہ ہے۔ آفاقیت اور ہمہ گیری تجربہ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو اچھا سمجھنا، ہر ایک سے محبت کرنا، انسان کی ناتجربہ کاری کو ظاہر کرتا ہے۔[11]

آپ نے دیکھا کہ تجربہ اور ناتجربہ کاری کے عام معنوں سے ہٹ کر کس طرح نئے زاویے سے دیکھا گیا ہے۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا مذکورہ بالا اقتباسات ثابت کرتے ہیں کہ مشکور حسین یاد میں ایک اچھے انشائیہ نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔اگر وہ اپنے طنزیہ مضامین کو انشائیہ ثابت کروانے پر مصر نہ ہوتے اور ایسے انشائیے مزید لکھتے رہتے تو انہیں انشائیہ نگاری میں بھی وہی بلند مقام حاصل ہوتا جو مقام انہیں طنزیہ و سنجیدہ مضامین لکھنے میں حاصل ہے۔

نظیر صدیقی

وزیر آغا کی جدید انشائیہ تحریک یا خالص انشائیہ تحریک کے معاصر انشائیہ نگاروں میں داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی کے بعد نظیر صدیقی ہیں۔ نظیر صدیقی وہ واحد انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے انشائیے کو طنزیہ و مزاحیہ مضمون بنا دیا۔ وہ خود لکھتے ہیں "میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصہ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔"[15] اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں" طنز اور مزاح ادب کی صنف نہیں صفت ہیں اس بنا پر عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ادب کی نمایاں صفت کے اعتبار سے مزاح نگار ہو لیکن اپنے ادب کی نمایاں صفت کے اعتبار سے ناول نگار یا ڈرامہ نگار ہو۔"[16] ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر صدیقی نظری طور پر انشائیہ کو مضمون سے الگ صنف تو تسلیم کرتے ہیں مگر طنزیہ مزاحیہ مضمون اور انشائیے میں عملاً فرق نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ خالص انشائیہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ "دوست اور دوستی"، "پدرم سلطان بود" اور "شادی" چند ایسے مضامین ہیں جنہیں آزادہ روی، ندرت، نکتہ آفرینی، تخلیقی تازگی کے ساتھ ساتھ دھیما طنز و مزاح کی وجہ سے انشائیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے انشائیے ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان انشائیوں میں نظیر صدیقی خود اپنے اصولوں کی پیروی کرنا بھول گئے۔ اگر اسی طرح اپنے قائم کردہ اصولِ انشائیہ کو بھول کر مزید طنزیہ مضمون لکھتے تو وہ بھی انشائیے بن جاتے۔

نظیر صدیقی نے انگریزی ایسے کا بھرپور مطالعہ کیا۔ انہوں نے تنقیدی مضامین میں تو انشائیے کی تعریف بہتر انداز میں کی لیکن اپنے طنزیہ مضامین لکھتے ہوئے ان کا تصور نہ رہا جو مانتیں یا لیمب کا تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ ان کا رشید احمد صدیقی کی انشائیہ پردازی کے سائے میں رہنا تھا۔ گو کہ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی تقلید میں تعمیری اور تخلیقی اسلوب بھی اپنایا اور اس چھاپ سے نکلنے کی کوشش بھی کی مگر اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

نظیر صدیقی کے انشائیوں کو طنزیہ مزاحیہ مضامین کے زمرے میں شامل کرنے سے ان کی مقبولیت یا معیار پر کوئی بر ااثر نہیں پڑتا بلکہ وہ طنز و مزاح کے زیر سایہ مضامین رکھنے اور دونوں میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ جہاں تک انشائیہ نگاری کی چند اہم خصوصیات کی موجودگی کی بات ہے تو سرسید، ناصر علی، آزاد، شرر، حسن نظامی سے لے کر نیاز اور رشید احمد صدیقی تک سب مشاہیر کے مضامین میں انشائی عناصر موجود ہیں البتہ انگریزی لائٹ یا پرسنل ایسے یا مونتین کے ایسانی کی خالص صورت وہ ہے جس کے نمونے "لمحے" از داؤد رہبر،" بے ترتیبی "از جاوید صدیقی اور "پہاڑ، پڑھانا، غصہ، جھوٹ"" از ممتاز مفتی کے انشائیوں میں یا پھر وزیر آغا اور ان کے تصور انشائیہ سے وابستہ مشاہیر کے انشائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے نظیر صدیقی ان میں شامل نہیں کئے جاسکتے البتہ نظیر صدیقی بحیثیت نقاد، شاعر، مضمون نگار اور مترجم منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں۔

انور سدید

اردو انشائیہ نگاری کی تحریک میں انور سدید کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ انہوں نے انشائیہ کے خدوخال کو واضح کیا اور اس کی پہچان کروانے میں کامیابی سے سرفراز ہوئے۔ انور سدید بنیادی طور پر ایک ناقد اور تبصرہ نگار ہیں۔ انہوں نے تخلیقی تحریروں کی بہ نسبت تنقیدی مضامین زیادہ لکھے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی بعض اصناف پر مکمل کتابیں بھی تحریر کیں۔ انور سدید نے متعدد مضامین لکھ کر صنفِ انشائیہ کے تعارف، تجزیہ، اور تنقید کا فریضہ انجام دیا۔ اسی طرح صنف انشائیہ سے متعلق گاہے گاہے اٹھائے جانے والے سوالوں پر جوابی مضمون لکھ کر اس صنف سے متعلق مباحث کا تجزیہ کر کے اپنے خیالات کو واضح کیا۔ "انشائیہ اردو ادب میں" جیسی مستقل تصنیف کے ذریعے اس نو خیز صنف کا مکمل جائزہ پیش کیا۔ انور سدید نے جہاں اردو انشائیے پر پڑی ہوئی غلط فہمیوں کی گرد صاف کی وہیں اس سے متعدد خوبصورت انشائیے بھی رقم کئے۔ "غالب کے نئے خطوط" ان کے اندر پوشیدہ تحریف نگاری اور ظرافت نگاری کی بھرپور صلاحیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں وہیں ان کے انشائیوں کا مجموعہ " ذکر اس پری وش کا" ان کی انشائیہ نگاری کی تخلیقی صلاحیت کا پرتو ہے۔ فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو انور سدید کے انشائیے قدرِ اول کی تخلیقات ہیں۔ اسی اعتبار سے انور سدید کو عصری انشائیہ نگاروں میں ایک خاص مقام حاصل

ہے۔انور سدید اپنے انشائیوں میں تاریخی اور تہذیبی عوامل کے تجزیہ کو تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر ایک ادبی شان عطا کر دیتے ہیں۔ ہمارے شعور میں موجود اشیاء اور حقائق کی صورتیں انشائیہ نگار کی گفتار کی گل افشانی کا سبب بنتی ہیں جو انور سدید کے انشائیوں کی ایک خوبی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ قدیم میں یہی حرکت نمرود سے اس وقت سرزد ہوئی جب اس نے زادۂ خاک ہونے کے باوجود خدائی کا دعویٰ کر دیا اور اپنے جیسے انسانوں کو مجبور کیا کہ اس کے آگے سربسجود ہوں۔ نخوت اور تکبر کا یہ انداز ایک سرپھرے مچھر کو پسند نہ آیا اور وہ محض تفننِ طبع کے لیے نمرود کی ناک میں گھس کر سحرِ نغمہ جگانے لگا۔ پھر یہ خلوت اسے ایسی پسند آئی کہ مچھر نے وہیں بیٹھ کر عرفان حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ نمرود جس کے سامنے ساری خدائی سربزانو تھی اس مچھر کے سرمدی نغمہ کی تاب نہ لا سکا۔[12]

انور سدید کے انشائیے دسمبر، مچھر کی مدافعت میں، مونچھیں، غلطی کرنا، تاروں بھری رات اور ذکر اس پری وش کا وغیرہ کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے گویا انور سدید انشائیے کے موضوع کو تاریخی اور تہذیبی پسِ منظر میں رکھ کر اس کی نت نئی جہات کو ایک نئی روشنی میں دکھا رہے ہیں۔ انور سدید کے انشائیے سماجی زندگی کی تصویریں دکھا کر فنکارانہ انداز میں نئے حقائق طشت از بام کرتے ہیں۔ انور سدید کے انشائیوں میں تاثرات اور خواہشات کا اظہار نہایت دلکش انداز میں ہوا ہے۔ انور سدید کے انشائیوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے گویا وہ زندگی کو اپنے طور پر برتنے اور روزمرہ کے واقعات کو باندازِ دیگر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں گویا زندگی کے معمولات ان کے نزدیک ایک خواب ہیں اور وہ اپنے انشائیوں میں انوکھی دلکش تعبیروں کے ساتھ اس خواب کو بیان کرتے ہیں۔ اپنے ایک انشائیے میں پتنگ بازی کا ذکر کرتے ہوئے انور سدید پتنگ کو فرد اور قوم کے تناظر میں دیکھتے ہوئے جس قسم کے فلسفیانہ خیالات کو نہایت سہل انداز میں بیان کرتے ہیں وہ نہ صرف ہمارے لئے دلچسپ اور انوکھے ہیں بلکہ چشم کشا بھی ہیں۔

ان کے انشائیے ' مچھر کی مدافعت میں مچھر اور انسان کو تہذیبی پس منظر میں رکھ کر زندگی کے نئے گوشے بے نقاب کئے گئے ہیں یہ انشائیہ نہ صرف طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے بلکہ سوچ کے انوکھے پن کو تحریف نگاری کے ذریعے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا کرتا ہے۔ انور سدید نے اظہار کے مختلف ذرائع کو نہایت سلیقے کے ساتھ

اپنایا ہے ان کے انشائیوں میں کہیں شاعرانہ احساس کی کار فرمائی نظر آتی ہے، کہیں افسانوی انداز یا ڈرامائیت نمایاں ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا انشائیہ موضوع کو فنکارانہ اور دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔

غلام جیلانی اصغر

وزیر آغا کی انشائیہ تحریک کے السابقون الاولون میں ایک نام غلام جیلانی اصغر کا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیے شوخی، شگفتگی اور برجستگی کے رنگارنگ پھولوں سے پُر بہار اور شاداب ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز و ظرافت کا داخلہ ممنوع نہیں ہے مگر وہ اس قدر سبک اور ہلکا ہے کہ انشائیے کو نظیر صدیقی کے انشائیوں کی طرح طنزیہ مزاحیہ مضمون بننے سے روک لیتا ہے۔ کیونکہ انشائیے میں طنز و مزاح کسی منصوبے کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ پھر بھی انشائیہ کی لہریں انہیں بلند نہیں ہونے دیتی۔ غلام جیلانی اصغر اس لحاظ سے کامیاب انشائیہ نگار ہیں۔ دیکھیے

> "تسخیر کائنات کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے جب میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے space کی کمی کا اندازہ ہوا۔ ایک کمرے میں میرے بیوی بچے سوتے جاگتے دوسرے کمرے میں میں خود پناہ گزیں تھا تیسرے میں کچن اور باتھ روم تھا۔ اب میں اتنی بڑی کائنات کو کہاں رکھ سکتا تھا؟ لیکن میں نے اس منصوبہ کو بلکل ترک نہیں کیا بلکہ وہ 'کر سکے' کی سطح سے اتر کر 'کبھی کر سکوں گا' کے تہہ خانے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ تہہ خانہ میری ذات کا LUMBERROOM ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کی متاع عزیز کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں میری پہلی محبت بھی ہے۔ جس کی تسخیر میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اس میں میری وہ نوکری بھی تھی جسکا آخری سرا صوبہ کی گورنری سے جا ملتا تھا۔ اس میں میرا نکاح ثانی بھی تھا جس کے لیے میں نے ہیلن آف ٹرائے سے لے کر ایلزبتھ ٹیلر تک سب باسلیقہ خواتین کی باقاعدہ ایک فہرست مرتب کر رکھی تھی۔[13]

بے تکلف انداز میں خیال افروزی اور فکر انگیز باتیں ان کے انشائیوں کی ایک خاص خوبی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیے بھی اس خوبی سے متصف ہیں۔ غلام جیلانی اصغر آزادی اور غیر رسمی طریقہ کار کے باوجود موضوع سے ایک رابطہ قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کسی چیز کے انوکھے پہلو روشن کرنا بھی انشائیے کی سب سے اہم

خصوصیت ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں یہ خصوصیت بھی اپنی پوری آب وتاب سے روشن نظر آتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> "گالی کے قومی فوائد کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ جس طرح پردے کے کچھ قومی فوائد ہیں مثلاً آدمی بدصورت عورتیں دیکھنے سے بچ جاتا ہے۔ اگر گالیاں عام ہو جاتیں تو پاگل خانے کی بنیاد میں خلل پیدا ہو جاتے۔ مزید براں گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔ آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگادی جائے۔ اسی لئے ایک اچھے جمہوری نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسمبلی کی کارروائی میں نکتہ اعتراض کا آغاز اور انجام گالی پر ہوتا ہے۔[14]

آپ نے دیکھا کہ گالی جسے ہمیشہ برا سمجھا جاتا ہے۔ کسی نئے زاویے سے دیکھا گیا ہے

جاوید صدیقی

اردو انشائیہ کو ایک خالص شکل میں پیش کرنے کا کام ایک تحریک کی صورت میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا لیکن وزیر آغا سے پہلے ڈاکٹر داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی اور نظیر صدیقی نے اس کام کا آغاز کیا۔ اول الذکر تینوں ادیب ایک ایک یا چند انشائیوں کے لکھنے کے بعد پیچھے ہٹ گئے البتہ نظیر صدیقی پیچھے تو نہیں ہٹے لیکن انشائیے کو طنزیہ ومزاحیہ مضمون بنادیا۔ جاوید صدیقی، داؤد رہبر اور ممتاز مفتی نے اپنے انشائیوں کو انشائیوں کا نام نہیں دیا کیونکہ اختر اورینوی کے پیش کردہ لفظ انشائیہ کو کسی نے قبول نہیں کیا تھا بلکہ وزیر آغا نے بھی اختر اورینوی کے بجائے کسی اور رسالے میں یہ لفظ پڑھ کر اپنی مخصوص تحریروں کے لیے اختیار کیا تھا۔ جاوید صدیقی کے مضامین "میں ایک فلسفی ہوں" اور "میں تنہائی کا شیدائی ہوں" انشائی خوبیاں تو رکھتے ہیں لیکن وہ خالص انشائیے نہیں جب کہ "بے ترتیبی" مکمل انشائیہ ہے۔

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے افسانے میں نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ مخفی مفاہیم کو گرفت میں لینے کا جاندار اسلوب جو انہوں نے افسانوں میں اختیار کیا، انشائیوں میں انہیں کامیابی عطا کرتا ہے۔ ان کا مضامین

اور انشائیوں کا ملا جلا مجموعہ 1954 میں "غبارے" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دو مضامین "عورت اور جنسیات" اور مشکلات اور محبت" کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین انشائیہ کی صنف کے زمرے میں آتے ہیں۔ "عورت اور جنسیات" اور مشکلات اور محبت" کی سنجیدگی بوجھل پن اور طوالت مضمون کی خوبیاں اور انشائیے کی خامیاں ہیں۔ معمولی موضوعات کے غیر معمولی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اسلوب اور پیشکش بھی انشائیے کی ہے۔ انشائیوں میں پہاڑ، پڑھانا، پہاڑے، باپ، غصہ، جھوٹ وغیرہ ان کے معیاری انشائیے ہیں۔

سلمان بٹ

سلمان بٹ طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے معروف شخصیت ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں وہ انشائیے کی طرف آئے۔ وہ کئی موضوعات کو تاریخی اور مذہبی پس منظر میں رکھ کر اس کی ایک نئی معنوی جہت دریافت کرتے ہیں۔" جمعہ "اور "دن منانا "ان کے قابل ذکر انشائیے ہیں۔ ان کے مضمون بدصورتی میں بھی انشائیہ کے نقوش موجود ہیں۔ اور کئی پیرے خالص انشائیے کی ذیل میں آتے ہیں۔ بدصورتی کے موضوع پر وہ بالکل نئے زاویے سے مشاہدات پیش کرتے ہیں۔ بدصورتی کو معاشرے میں اپنی جگہ اہم حیثیت دیتے ہیں۔ وہ باطن کی خوبصورتی کو حقیقت تصور کرتے ہوئے بدصورتی کو اس کا ایک پردہ قرار دیتے ہیں۔ گویا انہوں نے باور کرایا ہے کہ کسی خوبصورت چیز پر گندا یا پرانا پردہ پڑا ہو تو وہ چیز اپنی خوبصورتی کو قائم رکھتی ہے۔ جب بھی اس سے پردہ اٹھایا جاتا ہے تو وہ اپنے حسن کی پہچان کرا لیتی ہے۔ وہ انشائیہ" بد صورتی " میں عبرت کے کئی پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

سلیم آغا قزلباش

سلیم آغا قزلباش انشائیے کی تحریک کے پہلے دور کے نوجوان انشائیہ نگار تھے لیکن ان کا اعزازیہ ہے کہ اپنے معاصر سینئر انشائیہ نگاروں کے درمیان جونیئر ہوتے ہوئے بھی سینئرز کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی انفرادیت عمیق فکر، سادہ اسلوب غزل کی پرکاری اور تازہ کاری ہے۔ وزیر آغا کی طرح ان کے ہاں بھی زمینی ماحول اور ثقافت سے لگاؤ ہر مقام پر نظر آتا ہے۔ وہ اشیاء کو جب نئے زاویے سے دیکھتے ہیں تو وہ ان سے ہم کلام دکھائی

دیتی ہیں۔ سلیم آغا اکثر انشائیوں کے لئے موضوعات معمولی اشیاءسے منتخب کرتے ہیں اور ان اشیاء میں سے اکثر کا تعلق زمینی ماحول سے ہوتا ہے۔

وہ اشیاء کے حوالے سے رویوں تک پہنچنے کی مؤثر اور کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ وہ اشیاء کے بطون میں پنہاں ایک نہ نظر آنے والی کائنات کو دریافت کرتے ہیں۔ اور یہی ان کے انشائیوں کا جوہر ہے۔ چنانچہ ان کا کمال جہانِ بینا کو ایک جہانِ دگر کا آئینہ بنانے میں ہے۔ اکثر انشائیہ نگار پہلے نقاد اور طنزومزاح نگار ہوتے ہیں ، پھر انشائیہ نگار بنتے ہیں لیکن سلیم آغا قزلباش افسانہ نگاری سے انشائیہ نگاری اور انشائیہ نگاری سے افسانہ نگاری کی طرف دو طرفہ سفر کرتے والے فنکار ہیں ۔ لہٰذا انکے انشائیوں میں افسانوی رنگ بھی ہلکے پھلکے انداز میں کارفرما نظر آتاہے۔ سلیم آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ سرگوشیاں 1981 میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسرے مجموعے" آمنا سامنا "کی اشاعت 1987 میں ہوئی۔ سلیم آغا اپنے معاصر میں ہی کم عمر ہونے کی وجہ سے چھوٹے ہیں مگر انشائیے میں وہ ان میں سے کئی سینئرز کے کاندھوں سے اوپر نکل گئے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر

انگریزی لائٹ ایسے کے طرز پر شخصی واردات کا التزام اور ندرتِ خیال کی بنیاد پر مضمون نگاری کا جو سلسلہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں وزیر آغا نے شروع کیا تو ماہنامہ ' ادبی دنیا 'میں اسی طرز کو فروغ دیا گیا۔ آگے چل کر انشائیہ نگاروں کا ایک قافلہ سا بن گیا۔ اس سفر کی ابتدا میں جن ادیبوں نے اردو انشائیہ کی وادی میں اولین نقوش ثبت کئے ان میں سب سے اہم نام ڈاکٹر دا وٗد رہبر کا ہے۔ڈاکٹر دا وٗد رہبر نے اس صنف میں چند معیاری اور معنی خیز نمونے پیش کئے آگے وہ اس سفر کو جاری نہ رکھ سکے۔ ان کی تحریروں کی غیر معمولی ادبی حیثیت کے سبب ڈاکٹر دا وٗد رہبر اردو کے انشائیہ نگاروں میں آج بھی قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں ان کا انشائیہ ' لمحے ' بہت زیادہ مقبول ہوا۔ڈاکٹر دا وٗد رہبر کے مضامین کا مجموعہ "نسخہ ہائے وفا " شائع ہو چکا ہے۔داؤد رہبر کے انشائیوں میں فلسفیانہ اور آزادانہ فکر کے علاوہ رعنائیِ خیال بھی پا

ئی جا تی ہے۔ داؤد رہبر کے انشائیوں میں شاعرانہ احساس اور فلسفیانہ افکار کا حسین امتزاج موجود ہے۔

ڈاکٹر دا ؤد رہبر کے انشائیے اشیاء کے فکر انگیز اور مسرت افزا پہلوؤں کا انکشاف کر کے انشائیہ نگار کی فکری توانائی اور احساس و مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں اس کے علاوہ ان کے انشائیوں کی امتیازی خصوصیت ایک تخلیقی مسرت ہے جو ان کی تحریروں میں رواں دواں نظر آ تی ہے اور اشیاء کے نئے پہلوؤں کی دریافت پر اس مسرت کا وافر حصہ تخلیق کار کے ساتھ ہی قاری کے حصے میں بھی آ تا ہے۔

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کا مطالعہ وسیع مشاہدہ بے کراں تجربہ مبنی بر حقیقت اور اسلوب تخلیقی تازگی اور شگفتگی سے آراستہ ہے۔ پاشا موضوع کا انتخاب کرنے کے لیے سامنے کی چیزوں پر نگاہِ انتخاب ڈالتے ہیں جو روزمرہ زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ پھر ان چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھ کر اس کے مخفی مفاہیم تک عمودی سفر کرتے ہیں

احمد جمال پاشا جن کی شہرت طنزو مزاح نگار کی حیثیت ہے مگر انہوں نے کمال چابکدستی سے انشائیے کو طنزومزا ح سے الگ صنف کے طور پر یوں برتا کہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور انشائیوں میں واضح فرق الگ شناخت بڑی آسان ہوگئی۔ احمد جمال پاشا اپنے انشائیوں میں معمولی سے موضوع کو لیتے ہیں اور اس میں فلسفہ و منطق اور فکر و تدبر کو اس طرح ملاتے ہیں کہ وہ انشائیوں میں جذب ہوجاتے ہیں ۔انشائیہ "چیخنا" میں چیخنا ایک عام اور بے وقعت عمل ہے بلکہ دوسروں کے لئے ذہنی اذیت ہے لیکن احمد جمال پاشا نے اسی نقطہ کی مناسبت سے مخفی مفاہیم کے موتیوں کا ڈھیر لگا دیا ہے

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ احمد جمال پاشا زندگی کی بو قلمونی اور تخلیقی تازگی سے مرتب اسلوب کی وجہ سے اور انشائیے کی تمام اہم خصوصیات کو ملحوظِ خاطر رکھنے کے باعث چوٹی کے انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں۔

کامل القادری

کامل القادری کی بے وقت موت نے ان کے انشائیوں کی تعداد بڑھنے نہ دی۔ مگر "الگنی "لکھنے والے انشائیہ نگار نے کئی یادگار فن پارے پیش کردئے تھے۔ کامل القادری کے انشائیے ایک نئے جہان کی سیر کراتے ہیں ۔ وہ قاری کو اپنے مشاہدے سے بصیرت فراہم کرتے ہیں۔ ان کا موضوع پیش کرنے کا انداز بھی چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ کامل القادری کے انشائیوں میں انشائیے کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کفایت نقطی، اختصار، ندرت خیال، خیال افروزی اور بے کراں تخیل، عدم تکمیل وغیرہ انہوں نے کئی ایسے موضوعات کو منتخب کیا جو نامانوس تھے۔ مگر انہوں نے خیال آرائی سے خیال آفرینی اور خیال آفرینی سے خیال افروزی تک اسے لے جا کر مانوس کر دیا۔ الگنی بھی ایسا ہی خیال آراء، فکر انگیز اور مسرت افزاء انشائیہ ہے۔

رام لعل نابھوی

رام لعل نابھوی اردو نثر کا ایک معروف نام ہے۔وہ بنیادی طور پر طنز نگار تھےلیکن خالص انشائیے لکھ کر انہوں نے ثابت کر دیاکہ طنزومزاح پر مبنی مضامین اور انشائیہ میں کیا فرق ہے۔ انکا نمائندہ انشائیوں کا مجموعہ"آم کے آم "جہاں انشائیوں کا مجموعہ ہے وہاں اس صف پر انکا ایک تنقیدی مضمون بھی شامل ہےجو انکے تنقید نگاری کے فن پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔"آم کے آم " 1983میں منظر عام پر آیا جس میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔"آم کے آم "میں شامل ان کا تنقیدی مضمون بھی خاصے کی چیزہے۔رام لعل نابھوی خالص انشائیہ نگار ہیں۔انہوں نے انشائیوں کو انکی خصوصیات اور تکنیک کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے رقم کیا۔انکا اسلوب سادہ،بے تکلف اور رواں دواں ہے۔ان کے اسلوب میں سادگی اور شگفتگی ان کے انشائیوں کو دلکش اور خوبصورت بنا دیتی

ہے۔ ان کے انشائیوں" انتظار"،" فیشن" "مسئلہ"،"تنہائی "وغیرہ میں تجسیم کی یہ خوبی موجود ہے۔رام لعل نابھوی کے انشائیوں میں اختصار اور کفایت لفظی کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔انہوں نے تخیل، تفکر اور استعارے کا استعمال بھی بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ان کی تحریروں میں انکشافِ ذات کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔اس سلسلے میں وہ ذہانت،خرد، اشاروں، کنایوں ، تخیل، استعارات غرضیکہ بہت سے محاسن کو جمع کر دیتے ہیں۔

مثلاًانشائیہ "انتظار"ہی کو لیجیے جو شروع سے آخر تک قاری کواپنی گرفت میں رکھتا ہے۔اس انشائیے میں رام لعل نے پوری کائنات کو الٹ پلٹ کر دیا ہے۔بات سے بات ایسی نکلی کہ شگفتگی اور فلسفہ ایک دوسرے میں مدغم ہو گیے۔"انتظار"رام لعل کا ایک ایسا انشائیہ ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتا۔

اکبر حمیدی

اکبر حمیدی انشائیے کے میدان میں تاخیر سے اترنے کے باوجودانشائیے کے لئے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انشائیے کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور انشائیہ نگار بھی۔ اس لئے ان کی شاعری میں انشائیہ کے نقوش اور انشائیے میں شعریت کی نزاکت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کاانشائیہ" خالی گیراج "اردوکے بہترین انشائیوں میں شامل ہے۔اس انشائیے میں اکبر حمیدی آخری دس الفاظ میں قاری کو چونکا دیتے ہیں اور وہ جو انشائیے کے پچھلے صفحات پڑھتا آرہا ہوتا ہے اچانک خالی گیراج کے اس نئے رخ کی طرف متوجہ ہوتاہے اور یوں اکبر حمیدی اسے مسرور و محظوظ کرتے ہوئے اسے ایک معمولی خبر کے غیر معمولی پہلو سے بھی آگاہ کردیتے ہیں۔ اس اقتباس میں فارغ آدمی کے لئے خالی گیراج کا استعارہ استعمال کرنا ان کی تخلیقی صلاحیت کو آشکار کرتا ہے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی کی خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔اکبر حمیدی نے اپنے انشائیے" ٹیلی فون کال "میں انشائیے کو مکالمہ بازی سے بھی مزین کیا اور انشائیے کو انشائیے کے مقام سے گرنے بھی نہیں دیا اور اس

نئے تجربے سے انشائیے کے فن کو وسعت بھی عطا کردی۔ اکبر حمیدی نے انشائیوں میں کئی تجربے کئے اپنے انشائیے" گوجرانوالہ "میں انہوں نے ایک شہر کو موضوع بنایا۔ اس انشائیے میں خود نوشت کا رنگ کافی زیادہ ہے اور میرے خیال میں وہ اس تجربہ میں مکمل کامیاب نہ ہوسکے مگر انشائیہ پھر بھی جاندار ہے۔ اکبر حمیدی کا ایک اور کارنامہ انشائیے کو یکسانیت سے بچانے کے لئے مسلسل انشائیہ لکھنے کی طرف توجہ دلانا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیے" میں سوچتا ہوں "میں گھمبیر اور دکھ بھرا لہجہ اختیار کیا ہے۔" نظام سقہ" میں تاریخی ماحول انشائیے" ٹھینگا باجے "میں سیاسی ماحول ، سپنوں کا گاؤں اور بگڑا ہوا بچہ وہ انشائیے ہیں جن میں اکبر حمیدی نے نظریاتی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر حمیدی انشائیے کے مجتہد بھی ہیں اور درجہِ بلند پر فائز بھی۔

بشیر سیفی

بشیر سیفی اردو انشائیہ میں ایک معتبر نام ہے ۔ انہوں نے نہ صرف انشائیے لکھے بلکہ "اردو میں انشائیہ نگاری "کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی شخصیت بھی ہیں۔ بعد میں انھوں نے اسی مقالے کو کتابی شکل میں" اردو میں انشائیہ نگاری "کے نام سے 1989 میں شائع کیا۔ اسی طرح وہ انشائیہ کے اوائل دور کے نقاد بن کر بھی ابھرے۔انشائیہ "برزخ" میں عالمِ برزخ کو ایک نئی جہت کے ساتھ دیکھا اور برزخ کی کیفیت جو کہ موت اور زندگی کے درمیان عارضی وقفہ کا نام ہے۔ اسے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کی کیفیت پر منطبق کیا۔

محمد اسلا م تبسم

محمد اسلام تبسم اپنے انشائیوں میں مانتین کی طرح بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔۔ ان کا اسلوب دلکش اور دلچسپ ہے۔ وہ تاریکی میں چھپی حقیقت کو روشنی میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ ان کا انشائیہ" جنگل "ایک کامیاب انشائیہ ہے۔۔

خالد پرویز صدیقی

خالد پرویز صدیقی بھی اردو انشائیہ کا ایک معتبر نام ہے۔ خالد پرویز صدیقی بعض دفعہ موضوع مکمل کردیتے ہیں اور عدم تکمیل کی خصوصیات کو قائم رکھنے کے لئے نیا موضوع شروع کرکے نامکمل چھوڑ دیتے ہیں جس میں ایک آورد کا عنصر پایا جاتا ہے۔

انجم انصار

انجم انصار کے انشائیوں میں تخیل اور فکر شانہ بشانہ رہتے ہیں۔ وہ موضوع کی مطابقت سے لہجہ اور زبان بھی تبدیل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً ان کے انشائیے" منگنی کی انگوٹھی "کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ انشائیہ کسی عورت نے تحریر کیا ہے اور لطیف احساسات انشائیے میں ڈھلتے محسوس ہوتے ہیں۔

منگنی کی انگوٹھی ان کانامورانشائیہ ہے۔

ارشد میر

اردو انشائیے میں ارشد میر کی انفرادیت ان کا نفسیاتی اور سماجی مطالعہ ہے

ان کے انشائیوں میں "تولیہ"، "نعرہ"، "کڑھنا، ۔" استعفے"، "اور "دوپٹہ "خالص انشائیے ہیں

طارق بشیر

طارق بشیر اردو انشائیہ نگاروں کے جھرمٹ میں ایک روشن ستارہ ہیں آپ کا انشائیہ "پڑچھتی "مقبول انشائیہ ہے۔ کامل القادری کے انشائیے اسلوب پیشکش ،نکتہ آفرینی، خیال افروزی اور فکر انگیزی میں بالکل مختلف ہیں اور اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی طرز میں منفرد ہیں۔

حامد برگی

حامد برگی کے انشائیے فکر انگیز ،خیال افروزاور تخلیقی تازگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ان کا انشائیہ" کھڑکی "اعلیٰ درجے کا انشائیہ ہے۔ جس میں وہ کھڑکی کے استعارے کے ذریعے پر تحیر پہلو سامنے لاتے ہیں کبھی قانون میں لچک کو فرار کی کھڑکی بتاتے ہیں اور کبھی زندگی اور ابدیت کے درمیان موت کو بھی کھڑکی قرار دیتے ہیں۔"نیند"،" شکوہ دوستوں کے نہ ہونے کا"، "آشوبِ علم" ،" اداکاری"اور " عام آدمی "ان کے مقبول انشائیے ہیں۔ ان انشائیوں میں انکشافِ ذات بھی ہے۔ حامد برگی کے خصوصی اہمیت کے حامل انشائیوں میں" سدا کے کنوارے "سرِ فہرست ہے۔

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

راجہ محمد ریاض الرحمٰن خالص انشائیہ لکھنے والوں میں معروف نام ہے۔ ان میں تحقیق و جستجو کا میلان نظر آتا ہے۔ وہ قاری کو اپنے تخلیقی سفر میں شامل کر لیتے ہیں۔ راجہ محمد ریاض الرحمٰن کاانشائیہ"پانچواں موسم"خونصورت انشائیہ ہے جس میں انہوں نےدوریوں کے موسم کوپانچواں موسم قراردیاہے۔

شہزاد احمد

شہزاد احمد کے انشائیوں میں صوفیانہ اسراریت پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی تیسری آنکھ سے کائنات کو دیکھتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ کائنات بھی ان کے ساتھ گہرا ربط اور وابستگی رکھتی ہے۔ ان کے انشائیے" آہٹ"،" گھوڑا "اور" نیند سے پہلے "خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

محمد اسد اللہ

محمد اسداللہ کے انشائیوں میں انشائیے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ" بوڑھے کے رول میں1991ء میں شائع ہوا۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے خود

لکھا۔ ان کے انشائیے" انڈرلائن "لحاف"،" چوہوں سے نجات کی خاطر"، "پریس کئے ہوئے کپڑے "اور" بخار "وغیرہ ان کے خالص انشائیے ہیں۔

محمد اقبال انجم

محمد اقبال انجم حیات اور کائنات سے جڑی عام سی اور معمولی اشیاء کو انشائیوں کا موضوع بناتے ہیں ان کے انشائیوں میں تمام فنی لوازم موجود ہیں۔ وہ اشیاء کونئے اور انوکھے انداز اور مختلف زاویوں سے دکھاتے ہیں" سرگوشی"،" نبض"،" انگڑائی" ," کال بیل "اور" سگریٹ" ان کے ایسے انشائیے ہیں جن میں اقبال انجم اپنی فکری توانائی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں ۔

مشرف احمد

مشرف احمد کے انشائیوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ موضوع کے منفی پہلوؤں کو مثبت انداز میں بیان کرکے ندرتِ خیال ، فکر انگیزی، شوخی اور شگفتگی کو جنم دیتے ہیں ۔ اسی طریقہ کا ر سے نئے نئے حقائق سامنے آتے ہیں اور ان کے نئے نئے پہلو واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں مخفی مفاہیم تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

جان کاشمیری

جان کاشمیری کا اسلوب لطیف ، سبک اور دلکش ہے ۔ ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور انوکھاپن بھی۔ خیال آرائی ، فکر انگیزی،اورگہرائی میں اترنا ان کے فنِ انشائیہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اپنے انشائیے "رات رانی "میں تلازمات کو استعمال کرنے میں انہوں نے بڑی مہارت دکھائی ہے۔

ایک اور انشائیہ" ایش ٹرے "بھی پڑھئے تو انشائیے کی ساری خصوصیات دکھائی دیتی ہیں بالخصوص موضوع کا انوکھا پن۔

شمیم ترمذی

تخلیقی تازگی اور موضوعات کے نئے نئے پہلو دریافت کرنا شمیم ترمذی کے انشائیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا اسلوب ہلکا پھلکا اور رواں دواں ہے۔ وہ اکثر موضوعات میں تضادات کو اجاگر کرتے ہیں وہ کسی موضوع کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جن پرعام طور پر تاریکیوں کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ شمیم ترمذی کے انشائیوں میں اختصار نکتہ آفرینی جامعیت اور تخلیقی تازگی نمایاں نظر آتی ہے۔

محمد یونس بٹ

محمد یونس بٹ کے انشائیے قاری کو غوروفکر کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔" چاہِ خندان "ان کے انشائیوں کیا پہلا مجموعہ ہے۔ ان میں" جلنا" ، "ڈرنا"، "سستی"، "بے قاعدگی"،" امید"،" ٹیلی فون کا سفر"

قابلِ ذکر انشائیے ہیں۔ وہ ہر طرح کی اشیاء کو اپنے موضوعات میں لے آتے ہیں اور پھر اسی پر ایک نئے رخ سے نگاہ ڈالتے ہیں وہ تشبیہات کو استعمال کرتے ہوئے صورت حال کو ایک نیا رنگ دیتے ہیں۔

یونس بٹ کے انشائیوں میں ایک خامی ہے کہ وہ منتخب کردہ موضوع پر زیادہ دیر غوروفکر نہیں کرتے اور اگلے موضوع پر چلے جاتے ہیں اسطرح موضوع کے بہت سے پہلو نگاہ سے اوجھل ہوجاتے ہیں ۔ البتہ جولکھتے ہیں وہ عمدہ ہوتاہے۔

ناصر عباس نیّر

ناصر عباس نیّرکے انشائیوں میں ان کے تجربات اورذاتی تاثرات واضح نظرآتے ہیں۔وہ ان میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کونہ صرف تلاش کرتے ہیں بلکہ ان پر فنکارانہ انداز میں رائے زنی بھی کرتے ہیں ۔ قاری کووہ اپنے دلائل اور مشاہدات سےاپناہمنوابناتے ہوئےاس کااعتمادجیت لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگِ میل پبلیکیشنز،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۳۱۸

2۔ اختراورینوی،مقدمہ،مشمولہ "ترنگ"،مرتب: علی اکبر قاصد،مکتبہ خیال،سبز یباغ،پٹنہ،۱۹۴۴ء

3۔ نیاز فتحپوری،پیشِ لفظ،مشمولہ اردوایسیز،مرتب: ظہیر احمد مدنی،۱۹۸۱ء،ص۱۵

4۔ احمد جمال پاشا،اردو انشائیہ،مشمولہ ماہنامہ کتاب نما،نئی دہلی،نومبر۱۹۸۳ء،ص۳۹.

5۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور،1990ء،ص80:

6۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور،1990ء،ص50

7۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،موڑ،خیال پارے،اکادمی پنجاب،لاہور،اول،1961ء ،ص109:

8۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،بے ترتیبی، خیال پارے،اکادمی پنجاب،لاہور،اول،1961ء ،ص50:

9۔ مشکور حسین یاد، صبح(انشائیہ)،جوہر اندیشہ،لاہور،1975ء،ص33:

11۔ مشکور حسین یاد،تجربہ اورناتجربہ کاری(انشائیہ)،،جوہر اندیشہ، لاہور، 1975ء، ص 31:،32

باب سوم

مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ

چونکہ مشیل دی مونتین نے ہی انشائیے کا آغاز کیا اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسی کی تحریروں سے انشائیہ کے اصول نہ صرف اخذ کیے جائیں بلکہ انہی اصولوں کو بنیاد بنا کر انشائیے لکھے جائیں۔ زیرِ نظر مقالے کے پہلے باب میں انشائیے کے بانی مشیل دی مونتین کے تصورِ انشائیہ پر بالتفصیل بات ہو چکی ہے اور اس کے تصورِ انشائیہ کو سامنے رکھتے ہوئے انشائیہ کے جن فنی و موضوعاتی لوازم اور خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

مانتین کے تصورِ انشائیہ کی اہم خصوصیات:

1۔ انکشافِ ذات

مانتین کے تصورِ انشائیہ کی اہم ترین خصوصیت انکشافِ ذات ہے۔ انکشافِ ذات کا عمل وہ چشمہ ہے جہاں سے انشائیے کے باقی اجزا کی نہریں پھوٹتی ہیں۔ اس کا انفرادی نقطۂ نظر اس کے انکشافِ ذات ہی کا عکس ہے۔ لیکن اس کے اپنی ذات کے انکشاف کا خود نوشت سوانح، آپ بیتی یا بیانِ سرگذشت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے تجربات اور محسوسات کے ذریعے زندگی کے جزء یا کل کے متعلق انوکھا اور منفرد نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ اور ذات کا یہی انکشاف کائنات کی ہر چیز کو تفہیم کا نیا پیرہن عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انشائیے میں گم کر دیتا ہے تاکہ قاری اسے تلاش کر سکے۔ مانتین کا انشائیہ میں دخیل ہونا اس کے طرزِ بیاں کا مرہونِ منت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ انشائیہ میں وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنی شخصیت کا اظہار نہایت عمدگی سے کرتا ہے۔ اس کے انشائیے درحقیقت اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہیں جو اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مانتین کا انشائیہ اس

کے قاری پر ادب کی سنجیدگی سے الگ چند لمحوں کے لیے غیر سنجیدہ کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ اپنے انشائیوں میں اس کا اپنی ذات کا انکشاف اور مشاہدہ کر کے در حقیقت وہ کائنات کا مشاہدہ اور اس کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

I am not so good a naturalist (as they call it) as to discern by what secret springs fear has its motion in us; but, be this as it may, ¡¯tis a strange passion, and such a one that the physicians say there is no other whatever that sooner dethrones our judgment from its proper seat; which is so true, that I myself have seen very many become frantic through fear; and, even in those of the best settled temper it is most certain that it begets a terrible astonishment and confusion during the fit. I omit the vulgar sort, to whom it one while represents their great-grandsires risen out of their graves in their shrouds, another while werwolves, nightmares, and chimeras. (Translated by Charles cotton)[1]

میں فطرت کا کوئی خاص ماہر نہیں (جیسا کہ لوگ کہتے ہیں)۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس پراسرار راستے سے ہمارے اندر خوف کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال اس کا محرک کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ خوف جس سرعت سے ہمارے فیصلوں کو بدلتا ہے، کوئی دوسرا تیزی کے ساتھ اثرانداز نہیں ہوتا۔ یہ خیال یقیناً صحیح ہے اس لیے کہ میں خود اکثر اس جذبے سے مغلوب ہو کر ایک ہیجانی کیفیت کا شکار رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ انتہائی مستقل مزاج افراد بھی جب اس جذبے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ شدید استعجاب اور انتشار سے محفوظ نہیں رہتے۔ میں اس سوقیانہ قسم کے خوف اور ہیبت

کو نظرانداز کرتاہوں، جس کا محرک کوئی ایساواقعہ ہوتاہے جیسے آپ کے مرے ہوئے
بزرگوں میں سے کسی کا کفن پوش حالت میں قبر سے باہر نکلنا یا بھیڑیے کا روپ بدل سکنے
والے خیالی انسان یا آگ اگلنے والے عفریت کا نمودار ہونا یا کوئی بھیانک خواب۔42

اس کی انا میں نہ تو خودستائی ہے نہ خودنمائی بلکہ انکسار اور تواضع قہقہے۔نہ وہ معلم ہے نہ وعظ نہ مصلح بلکہ وہ قاری کا بے تکلف دوست ہے۔چنانچہ وہ اپنے ایک انشائیے میں لکھتا ہے:

I think it less hazardous to write of things past, than present, by how much the writer is only to give an account of things every one knows he must of necessity borrow Upon them.I am solicited to write the affairs of my own time by some, who fancy I look upon them with an eye less blinded with passion than another, and have a clearer insight into themby reason of the free access fortune has given me to the heads of various factions; but they do not consider, that to purchase the glory of Sallust, I would not give myself the trouble, sworn enemy as I am to obligation, assiduity, or perseverance: that there is nothing so contrary to my style, as a continued narrative, I so often interrupt and cut myself short in my writing for want of breath; I have neither composition nor explanation worth anything, and am ignorant, beyond a child, of the phrases and even the very words proper to express the most common things; and for that reason it is, that I have undertaken

to say only what I can say, and have accommodated my subject to my strength. (Translated by Charles cotton)[2]

میری دانست میں موجودہ صورتِ حال کے برعکس ماضی کے بارے میں لکھنا کم خطرناک ہے کیوں کہ اس مقصد کے لیے محض چند حقائق مستعار پیش کر دینے سے کام چل سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے مجھے موجودہ زمانہ کا ماجرا قلمبند کرنے کو کہا ہے کیونکہ ان کی دانست میں دیگر افراد کے مقابلہ میں شدتِ جذبات مجھ میں پریشان نگاہی پیدا نہیں کرتی۔۔۔اس لیے کہ میں اشیاء کا قریبی مشاہدہ بھی کر سکتا ہوں لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ میں یہ کام بھی سرانجام نہیں دے سکتا خواہ مجھے شہرتِ دوام ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ میں تو کارِ خیر، فکرِ مسلسل اور مستقل مزاجی کا جانی دشمن ہوں اور لوگوں کو اس کا اندازہ ہی نہیں کہ ایک طویل اور مربوط بیانیہ میرے اسلوبِ حیات سے کتنا غیر متعلق ہے۔ اسی لیے تو بسا اوقات میرا دم ٹوٹنے لگتا ہے جس سے میں رک جاتا ہوں۔ مجھ میں مواد کی مناسب ترتیب اور پیشکش کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ معمولی معمولی باتوں کے اظہار کے لیے بھی مناسب الفاظ اور جملوں کی تلاش کے معاملہ میں میں کسی طفلِ نادان سے کم نہیں ہوں۔ اسی لیے میں صرف وہی کہتا ہوں جو میں کہہ سکتا ہوں۔ میرا مواد میری توانائی کی مناسبت سے ہے۔ (ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس میں مانتین دراصل اپنی تخلیقی شخصیت کی توانائی اور اس کی مناسبت سے اپنے رجحانِ طبع کی غمازی کر رہا ہے ۔اس انکشافِ ذات میں اس کی انکساری نے "میں' کا مفہوم بالکل بدل دیا ہے۔ یہاں انانیت، نرگسیت اور خودستائی کا کوئی گذر نہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

Compare with such a one the common rabble of mankind, stupid and mean-spirited, servile, instable, and continually floating with the tempest of various passions, that tosses and tumbles them to and fro, and all depending upon others, and you will find a greater distance than betwixt heaven and earth; and yet the

blindness of common usage is such that we make little or no account of it; whereas if we consider a peasant and a king, a nobleman and a vassal, a magistrate and a private man, a rich man and a poor, there appears a vast disparity, though they differ no more, as a man may say, than in their breeches. neither the courage to die nor the heart to live, who will neither resist nor fly, what can we do with him? (Translated by Charles cotton.)[3]

انسانوں کے ایک ایسے مشترک ہجوم کا موازنہ کریں جس میں بے وقوف، کم ظرف، غلامانہ ذہنیت کے حامل اور مختلف قسم کے جذبات کے حامل لوگ شامل ہیں جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے، اور جن کا تمام تر دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔ اور تم اس ہجوم کے لوگوں میں باہم (معاشی، طبقاتی اور معاشرتی سطح کا فاصلہ) زمین اور آسمان کے فاصلے سے زیادہ پاؤ گے۔ لیکن ہم عام استعمال ہوتے ہوئے اس اندھے پن کا تھوڑا یا زیادہ کچھ بھی حساب نہیں دیتے۔ حالانکہ ہم غور کرتے ہیں تو ایک کسان اور بادشاہ، ایک آقا اور غلام، ایک مجسٹریٹ اور ایک عام آدمی ایک امیر اور ایک غریب کے درمیان وسیع عدم مساوات دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نیکریں دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں جیسا کہ کوئی کہہ سکتا ہے۔ نہ ان میں مرنے کی جرات ہے نہ جینے کا جذبہ، جو نہ مزاحمت کریں گے نہ فرار ہوں گے ہم ان کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟ (ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس مانتین کے انکشافِ ذات کی خوبصورت مثال ہے۔ زندگی سے مربوط یہ فکر انگیز انکشاف اس کے مشاہدے اور احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اس اقتباس میں طبقاتی نظامِ معاشرت کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن تازہ، دلچسپ اور شگفتہ انداز میں۔ یہی انشائیے کا حسن ہے۔

2۔ بے ربطی

مانتین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت بے ربطی بھی ہے۔اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ اس کے انشائیوں کے مختلف پیروں کا مرکزی موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ لیکن اس کے انشائیوں کی بے ربطی غزل کی بے ربطی جیسی ہے۔ جس طرح غزل کے تمام اشعار اپنی جگہ مکمل ہوتے ہیں اور اکثر اوقات اشعار کا ایک دوسرے سے بظاہر ربط بھی نظر نہیں آتا لیکن بحر، قافیہ اور ردیف کے ربط کے ساتھ ساتھ ایک غیر مرئی زنجیر تمام اشعار کو کڑیوں کی طرح آپس میں جوڑ دیتی ہے،مانتین کے انشائیوں میں بھی مختلف پیراگرافس میں بیان کی گئی باتیں بظاہر بے ربط ہوتی ہیں مگر ایک معنوی ربط ان میں بھی موجود ہوتا ہے اور موضوع سے بھی ان کا تعلق نہیں ٹوٹتا۔مانتین نے انشائیے میں بے ربطی، غیر رسمی طریق کار، بے ترتیبی، تنوع اور بوقلمونی پیدا کر کے اس صنف کو فطرت کے انتہائی قریب کر دیا۔ کیونکہ فطرت کا حسن اور دلکشی انہی خصوصیات میں مضمر ہے۔ کسی ریگزار میں اگے ہوئے بے ترتیب اور رنگارنگ پھول چمن کے ان پھولوں سے کہیں زیادہ دلفریب ہیں جنہیں ایک خاص ترتیب سے انسانی ہاتھوں نے سنوارا ہے۔ آسمان پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے بے شمار ستارے کیسا دلفریب منظر پیش کرتے ہیں۔انسانوں میں رنگ، نسل، سوچ، فکر، عقائد، تخیل، مزاج، آواز، عادات واطوار، شکل وصورت اور جنس وغیرہ، دیگر جانداروں میں انواع، ماحول، جبلت، شکل وصورت، میکانکی زندگی اور جمادات کے سائز، رنگ، چمک، وزن، طول، عرض اور قیمت کی رنگارنگی، تنوع اور بے ترتیبی ہی دنیا کا حسن ہے۔

3۔ غیر رسمی طریق کار

انشائیے کے موجد مشیل دی مانتین نے انشائیوں کو لکھنے کے لیے کوئی طریق کار یا رسمی شکل یعنی فارمیٹ (Format) وضع نہیں کیا جیسا کہ اکثر وبیش تر انگریز مضمون نگاروں نے اختیار کیا کہ جس میں پہلے ایک مرکزی خیال قائم کیا جاتا ہے پھر ابتدائیہ سے لے کر نتائج یا ماحصل کے بیان تک ایک رسمی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔مانتین نے انشائیہ میں نہ تو ایسا کوئی تکلف ہی برتا ہے اور نہ ہی کسی فارم یا فارمیٹ کی پابندی لگائی بلکہ انشائیہ نگار کو یہ آزادی عطا کی کہ وہ انشائیے کو جہاں سے چاہے شروع کر دے اور جس مرحلے پر چاہے ختم کر دے۔ مرکزی موضوع کو بدلائل ثابت کرنا اس کی ذمہ داری نہیں۔

4۔ عدم تکمیل

مانتین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت عدم تکمیل ہے۔اس سے مراد موضوع کی غیر سالمیت اور تشنگی ہے۔ کسی بھی موضوع پر جب وہ اظہارِ خیال کرتا ہے تو وہ بات سے بات پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور مرکزی بیان کو واضح کیے بغیر دوسری بات چھیڑ دیتا ہے۔ وہ موضوع کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو اس کے شخصی ردِ عمل سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

5۔ متنوع موضوعات

مانتین کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اس کے ایجاد کردہ انشائیوں کی کامیابی اس کی تازگی، انوکھے پن اور رنگارنگی میں ہی پوشیدہ ہے۔ اس کے موضوعات کی وسعت پوری زندگی اور تمام کائنات پر محیط ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو ہماری سامنے کے دنیا اور ہماری معمول کی زندگی سے تعلق تو رکھتے ہیں مگر یہ لوگوں کی توجہ کا مرکز کم ہی بنتے ہیں یا قارئین کی نگاہیں انہیں ان زاویوں سے کم ہی دیکھتی ہیں۔ اس لیے وہ ایسے نظر انداز شدہ اور معمولی موضوعات کو انشائیہ کے چراغ سے منور اور انشائیہ کے رنگارنگ پھولوں سے تروتازہ رکھتا ہے۔ موضوع کی شادابی وتازگی اس کے انشائیوں کی روح ہے۔ وہ حیات وکائنات کی معمولی سے معمولی اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز، تصور یا بات کو موضوعِ تحریر بنا سکتا ہے حتیٰ کہ وہ موضوعات جنہیں مضمون اور طنز ومزاح میں بھی شامل نہیں کیا جا سکتا مانتین انہیں بھی موضوعِ انشائیہ بنالیتا ہے۔ اس کے بعض انشائیوں کے درج ذیل عنوانات اس کا ثبوت ہیں۔

اداسی یا غم۔ جھوٹ۔ نکما پن کے بارے میں۔ آہستہ اور تیز گفتگو۔ تین اچھی عورتیں۔ سینیکا اور پلوٹارک کا دفاع۔ امراض دریافت۔ ناراضی کی سزا۔ خوف۔ نیکی۔ روحانی جذبات کو غلط فہمیوں پر خرچ کرنا۔ ارادہ ہمارے اعمال کا منصف ہے۔ غصہ۔ ایک بدمعاش بچہ۔ مجرم۔ تخیل امتحانات۔ دوستی۔ قدیم رسومات۔ مسکراہٹ پر، آنے والا کل نیادن۔ شراب خوری۔ شعور۔ کتابوں پر۔ ظلم پر۔ استعمال کامل بنادیتا ہے۔ اعزاز کے عوض۔ جلال۔ ذلت۔ ہم کچھ بھی خالص نہیں چکھتے ہیں۔ ہر چیز کا اپنا موسم ہوتا ہے۔ نفع اور دیانت۔ پچھتاوا۔ وغیرہ

6۔ اختصار

مانتین کے انشائیہ میں اختصار کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت ''موضوع کے لحاظ سے اختصار'' اور دوسری صورت ''اسلوب کے لحاظ سے اختصار''۔ پہلی صورت میں اختصار سے مراد یہ ہے کہ موضوع کے کسی پہلو کو تفصیل سے بیان کرنے کے بجائے اجمال پر نظر رکھی جائے۔ دلائل و براہین کے انبار لگا کر اپنے موقف کو منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا جائے اور نہ علمی یا فلسفیانہ بحث و مباحثہ میں الجھا جائے۔ دوسری صورت میں اختصار سے مراد کفایتِ لفظی سے کام لیا جائے۔ یعنی اپنے تجربات اور محسوسات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کیا جائے۔ اختصار سے مراد صفحوں یا سطروں کی تعداد نہیں اور نہ موضوع کا اختصار ہے نہ اس سے مراد سطحیت ہے بلکہ اختصار سے مراد جامعیت ہے۔ اور جامعیت سے مراد وہ تحریر ہے جو مختصر، پُر مغز اور بصیرت افروز ہو۔ مانتین کے انشائیوں میں اس کی چند بہترین مثالیں درج ذیل انشائیے ہیں:

OF RECOMPENSES OF HONOR, HOW OUR MIND HINDERS ITSELF ,
OF AGE,

7۔ مسرت آفرینی

مانتین کے انشائیے کی ایک خصوصیت قاری کو حظ و مسرت بہم پہنچانا بھی ہے۔ وہ یہ کام شگفتگی اور تخلیقی تازگی یا تازہ کاری کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ اس کی تحریر ہلکے پھلکے اور رنگین طرزِ بیاں کی حامل ہوتی ہے جسے پڑھنے سے قاری کا ذہن نہ تو بوجھ محسوس کرتا ہے اور نہ اسے کسی ذہنی ورزش کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے انشائیوں کی تخلیقی تازگی اور تازہ کاری اسے حظ، مسرت، بہجت اور سکون فراہم کرتی ہے۔ دنیاوی تفکرات، الجھنوں اور تناؤ کو علاج میسر آتا ہے۔ اور قاری نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تسکین بھی حاصل کر لیتا ہے۔ جہاں تک شگفتگی کا تعلق ہے یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی پھول کا کھلنا، خوشی، فرحت وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں شگفتگی سے مراد کلام بیان کیے جانے والے فرسودہ الفاظ و مضامین کو بھی اس چابکدستی سے پیش کیا جائے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ناگواری و فرسودگی محسوس ہونے کے بجائے خوشگواری و انبساط کا احساس ہو۔ شگفتگی کا تعلق لفظ اور معنی دونوں سے ہے۔ کلام میں تہہ داری اور گہرائی نہ بھی ہو جب بھی کسی پہلو سے شگفتگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

8۔ گپ شپ کا انداز

مانتین کے انشائیوں کی ایک خاص بات اس کا گپ شپ کا انداز ہے۔اس کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ساری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر پر سکون ماحول میں دوستوں سے گپ بازی میں مصروف ہے۔اور اسی گپ شپ میں وہ زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں تک کو بیان کرتا چلا جاتا ہے اور یوں کہ دوستوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس گپ شپ میں وہ کیا کچھ سیکھ چکے ہیں۔یہی پڑھنے والے کو شگفتگی عطا کرتا ہے اور اکتاہٹ نہیں ہونے دیتا۔وہ گفتگو کی اہمیت یوں بیان کرتا ہے:

The most fruitful and natural exetrcise of the mind,in my opinion,is conversation;I find the use of more sweet than of any other action of life;and for that reason it is that,if I were now compelled to choose,I should so I think,consent to loose my sight than my hear and speech ...The study of books is a languishing and feeble motion that heats not,where -as conversation teaches and exercises at once[4]

میری رائے میں ذہن کی فطری اور باثمر مشق گفتگو ہے۔میں نے اسے زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے زیادہ پر لطف پایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت مجھے دیکھنے اور سننے میں سے کسی ایک چیز کو چننے پر مجبور کیا جائے تو میں دیکھنے کے مقابلے میں گفتگو کو زیادہ پسند کروں گا۔مطالعہ کتب مردہ دل اور بے ہمت حرکت ہے۔اس حرکت میں آتشناکی نہیں ہے۔اس کے برعکس ایک ہی وقت میں گفتگو ہمیں تعلیم بھی دیتی ہے اور تربیت بھی کرتی ہے۔(ترجمہ راقم)44

اقتباس مرقومہ بالا میں بظاہر گپ شپ لگائی جارہی ہے مگر اس گپ شپ کی تہہ میں دیکھنے اور سننے کے حواس کی فعالیت کا تقابل پیش کر کے گفتگو کی اہمیت وافادیت بیان کی جارہی ہے۔

9۔ سبک اسلوب

مانتین کے اسلوب میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں جن خصوصیات کا ہونا ہر انشائیے میں ضروری ہے۔ان میں سے پہلی خصوصیت روانی، دوسری ترنم اور تیسری کفایتِ لفظی ہے۔روانی سے مراد یہ ہے کہ تحریر میں الفاظ وتراکیب بوجھل اور نامانوس نہ ہوں اور نہ خیال میں کوئی علمی پیچیدگی یا فلسفیانہ موشگافی ہو۔ترنم سے مراد یہ ہے کہ تحریر میں سادگی، سلاست اور موزوں الفاظ کا چناؤ ہو جب کہ کفایتِ لفظی اختصار کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔یعنی عمدہ اور کم الفاظ میں کسی بات کو اچھے انداز اور ڈھنگ سے پیش کرنا۔لیکن محض تحریر کی خارجی صورتوں یعنی الفاظ کی دروبست، قواعد کی پیروی، رموز و علائم وغیرہ کی پابندی کا نام ہی اسلوب نہیں بلکہ اسلوب درد حقیقت اس سے بلند تر شے کا نام ہے۔تحریر کی خارجی خصوصیات کا پایا جانا تو ہر تحریر میں ضروری ہے اور باقاعدہ مشق اور محنت سے ان خصوصیات کا پیدا کر لینا بھی کوئی مشکل امر نہیں۔چنانچہ اسلوب سے مراد دراصل وہ تحریر ہوتی ہے جس میں اسلوب کے خارجی پہلوؤں کے علاوہ لکھنے والے کی شخصیت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔اور جو اس کی تحریر کو دوسروں کی تحریر سے مختلف بنا دیتی ہے۔مانتین کی تحریروں میں اس کی شخصیت، اس کا مزاج، اس کا فطری رنگ طبیعت، اس کا طرزِ فکر، اس کی وہ تمام شعوری اور لاشعوری کیفیات جس نے اسے لکھنے پر آمادہ کیا، نیز اس کا ماحول اور عہد سب کارفرما ہیں اور انہی کے امتزاج نے اس کے اسلوب کی تشکیل کی ہے۔وہ لکھتا ہے:

> Compare with such a one the common rabble of mankind, stupid and mean-spirited, servile, instable, and continually floating with the tempest of various passions, that tosses and tumbles them to and fro, and all depending upon others, and you will find a greater distance than betwixt heaven and earth; and yet the blindness of common usage is such that we make

little or no account of it; whereas if we consider a peasant and a king, a nobleman and a vassal, a magistrate and a private man, a rich man and a poor, there appears a vast disparity, though they differ no more, as a man may say, than in their breeches. neither the courage to die nor the heart to live, who will neither resist nor fly, what can we do with him? Translated by Charles cotton)[5]

انسانوں کے ایک ایسے مشترک ہجوم کا موازنہ کریں جس میں بے وقوف، کم ظرف، غلامانہ ذہنیت کے حامل اور مختلف قسم کے جذبات کے حامل لوگ شامل ہیں جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے، اور جن کا تمام تر دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔اور تم اس ہجوم کے لوگوں میں باہم (معاشی، طبقاتی اور معاشرتی سطح کا فاصلہ) زمین اور آسمان کے فاصلے سے زیادہ پاؤ گے۔لیکن ہم عام استعمال ہوتے ہوئے اس اندھے پن کا تھوڑا یا زیادہ کچھ بھی حساب نہیں دیتے۔حالانکہ ہم غور کرتے ہیں تو ایک کسان اور بادشاہ، ایک آقا اور غلام، ایک مجسٹریٹ اور ایک عام آدمی ایک امیر اور ایک غریب کے درمیان وسیع عدم مساوات دکھائی دیتی ہے۔ان کی نیکریں دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں جیسا کہ کوئی کہہ سکتا ہے۔نہ ان میں مرنے کی جرات ہے نہ جینے کا جذبہ، جو نہ مزاحمت کریں گے نہ فرار ہوں گے ہم ان کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟(ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس میں مانتین کے اسلوب میں اسکی ذات صاف جھانکتی محسوس ہوتی ہے، جس سے اس کی شخصیت کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔زندگی سے مربوط یہ فکر انگیز انکشاف اس کے مشاہدے اور احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ اس اقتباس میں طبقاتی نظامِ معاشرت کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔لیکن تازہ، دلچسپ اور شگفتہ انداز میں۔اور یہی تازہ اسلوب انشائیے کا حسن ہے۔لہٰذا ہر انشائیہ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے اسلوب کو مانتین کی رکھی گئی بنیادوں پر اپنے اسلوب کی عمارت کھڑی کرے۔

10۔ دعوتِ فکر

انشائیہ کے علاوہ جملہ اصنافِ ادب خواہ وہ مضمون ہو خواہ افسانہ،ڈرامہ،ناول،رپورتاژ،خط، نظم ،قصیدو،مرثیہ،داستان، کہانی، مقالہ یا غزل کا شعر سب میں اختتام اور تکمیل کی خصوصیت ہوتی ہے۔یہ تمام اصناف سوچ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر قاری کو منزل پر پہنچا دیتی ہیں۔جب کہ انشائیہ نگار کو مانتین نے اتنی آزادی دے دی ہے کہ اس کی وجہ سے انشائیہ نگار کسی ایک موضوع پر لکھتے لکھتے کئی دوسرے موضوعات لے آتا ہے۔پھر اسی طرح وہ مرکزی موضوع اور اس سے تلازمۂ خیال میں آئے ہوئے دیگر موضوعات کو کسی منطقی اختتام تک بھی نہیں پہنچاتا۔اور یوں ایک جانب وہ ان موضوعات کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دیتا ہے تو دوسری طرف قاری کے اندر ایسی جستجو اور تحریک پیدا کر دیتا ہے جو قاری کو اس موضوع پر مزید سوچنے کی ترغیب دیتی ہے اور وہ خود اسے اختتام تک پہنچانے کی تگ ودو میں مصروف ہو جاتا ہے۔چنانچہ مانتین کا انشائیہ کو غیر سالم اور نامکمل چھوڑ دینا دراصل قاری کو ایک دعوتِ فکر دینا ہے۔چنانچہ قاری انشائیہ تو ختم کر لیتا ہے لیکن اس کا تخیل مصروف اور خیال متحرک ہی رہتا ہے۔گویا کہ مانتین اپنے انشائیوں کے قارئین کو بھی انشائیہ لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔چاہے وہ اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ بھی کر سکیں۔انشائیہ کی یہ ایسی منفرد خصوصیت ہے جو کسی اور صنفِ ادب میں نہیں۔

اردو ادب میں شعوری طور پر اور انشائیے کے نام پر مانتین کے انشائیے کے بنیاد گزاروں میں وزیر آغا ،مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، مشتاق قمر، جمیل آذر اور انور سدید وغیرہ اہم نام ہیں۔مشتاق قمر، جمیل آذر کے اس مقام کا اعتراف جس کا اعتراف بابائے انشائیہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں کیا

> اردو انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انہوں نے نہ صرف خود بہت خوبصورت انشائیے لکھے بلکہ اس سلسلے میں نئی پود کی تربیت بھی کی۔چنانچہ اگر آج چمن میں ہر طرف انشائیے کی داستان بکھری ہوئی نظر آرہی ہے اور دم بدم خوبصورت

اور تازہ انشائیے لکھے جارہے ہیں تو اہلِ نظر کی طرف سے اس بات کی شاباش ان دونوں ہی کو ملنی چاہیے۔"[6]

مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مندرجہ بالا خصوصیات کے حوالے سے مشتاق قمر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ لینے سے پہلے مشتاق قمر کے تصورِ انشائیہ کو دیکھیں۔

مشتاق قمر کا تصورِ انشائیہ

مشتاق قمر کے انشائیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں صحت مند رجحانات، ذوقِ لطیف، حسِ مزاح اور احساسِ توازن کی خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ایک بھرپور وجود، تواناذات، متوازن روح اور کھلے ذہن کی حامل شخصیت دکھائی دیتے ہیں ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

انشائیہ کا ایک داخلی عنصر انشائیہ نگار کا وہ ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جو مثبت سوچ کا ثمر ہے۔ انشائیہ نگار کی سب سے بڑی داخلی پہچان گہری مثبت سوچ کے ساتھ "لمحہ" کے الاؤ سے حظ کشید کرنا ہے اور زندگی کی جلی ہوئی راکھ سے سکون و طمانیت کے چند اجلے پھول ڈھونڈ نکالنا ہے۔[7] (مشتاق قمر، انشائیہ نگاری (مضمون)، مشمولہ انشائیہ کے فنی سروکار ص:199

انشائیہ کی اہم خصوصیات کے بارے میں مشتاق قمر کا تصور:

انشاپردازی اور انشائیہ نگاری میں فرق

انشاپردازی کسی صنف کا نام نہیں بلکہ ایک اسلوب یا طرزِ تحریر کا نام ہے۔ عبارت کا تعلق کسی بھی صنف سے ہو جمہور کی رائے کے مطابق خیالات کو عمدہ، خوشنما اور موثر پیکنگ میں نمائش کے لیے پیش کرنا یا صنائع وبدائع کا بناؤ سنگھار کر کے تحریر کی دلہن کی رونمائی کرنا انشا پردازی کہلاتا ہے ۔ انشاپردازی کا فن عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں آیا۔ عبدالحمید بن یحیٰ عربی کا پہلا انشاپرداز ہے۔ جس کے بعد ابن المقفع، الجاحظ، ابن العمید، صاحب بن عباد ، الخوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی، حریری وغیرہ نے اس فن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ ابن المقفع نے سنسکرت

سے کلیلہ ودمنہ کاعربی میں ترجمہ کیا اوراسے عربی سے فارسی میں منتقل کرنے کا کام ابوالمعالی نصراللہ بن محمد نے کیا یہ سب اپنی اپنی زبان کے اعلیٰ قسم کے انشاپرداز تھے۔فارسی کا سب سے اہم انشا پرداز قاضی حمیدالدین ہے۔قاضی حمید الدین نے مقاماتِ ہمدانی اورمقاماتِ حریری سے متاثر ہوکر مقاماتِ حمیدی تحریر کی۔

برصغیرپاک وہندمیں انشاپردازی کا آغاز خلجی اور تغلق ا دوارِ حکومت میں امیرخسرو کی تصنیف''اعجازِ خسروی''اور''انشائے ماہرو ''سے ہواجب کہ لودھی سلطنت کے معاصر دکن کی بہمنی سلطنت کا وزیرِ اعظم محمود گاواں انشاپردازی کا امام بن کر ابھرا۔محمودگاواں نے انشاپردازی کے فن پر''مناظرالانشاء ''اور خطوط نگاری پر ''ریاض الانشاء ''نامی کتب تصنیف کیں۔مغلیہ دورمیں ظہوری توشیزی اور ابوالفضل نے انشاپردازی میں بلندمقام حاصل کیا۔چونکہ مغلیہ خاندان کی حکومت کے اس دور میں سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اس لیے علم وادب سے لے کر پٹوار کے صیغے تک ہر جگہ فارسی کاہی سکہ چلتا تھا۔چنانچہ صوفیا کو چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا اکثر کام انشاپردازہی کرتے تھے۔اس کے لیے ہر لکھنے والے کو انشاپردازی سیکھناپڑتی تھی۔ اردوانشاپردازی میں بھی فارسی کی تقلید کرتے ہوئے فارسی آمیز پرتکلف زبان ہی استعمال کی گئی حتیٰ کہ خطوط سرکاری ہوں یانجی ، اجنبی کو لکھے جاتے ہوں یادوست کو،ان میں بھی وہی مقفع اور مسجع اسلوب اختیارکیا گیا۔اوران خطوط کو ''انشا'' کے نام سے ہی موسوم کیاگیا۔اس دور میں اردوزبان میں لکھے گئے کے خطوط کے مجموعوں پرفارسی زبان کے مجموعہ ہائے خطوط کاہی اثرتھا۔مذکورہ مجموعہ ہائےخطوط جن کاذکر عنوانِ بالا میں کیاگیاہے،سب کے سب انشاءپردازی کے پیرہن میں ملبوس اردو کی صنفِ مکتوب نگاری سے تو تعلق رکھتے ہیں مگر انشائیہ نگاری سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

مرزاغالب وہ انشاپرداز ہیں جنہوں نے اردوخطوط کوسب سے پہلے اس روش سے آزادی دلوائی اور اردو کو وہ اسلوب عطاکیا جو خالصتاً اردو کااسلوب تھا۔ ابتدا میں غالب بھی روایت پسند نظرآتے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے بتدریج اس رنگ سے خلاصی حاصل کر لی ۔اگرچہ

مرزاغالب کے خالص اردو خطوط میں انشائیے کی بہت سی صفات پائی جاتی ہیں لیکن انہیں صنفِ مکتوب نگاری میں ہی شامل کیا جاتا ہے۔

انشائیہ نگاری اورانشا پردازی دونوں کی نسبت توانشاء سے ہے لیکن انشاء پردازی اور انشائیہ نگاری میں بعد المشرقین ہے۔ اگر انشاء پردازی میں تکلف اورتصنع ہے تو انشائیہ نگاری میں بے تکلفی اورسادگی ہے۔اگرانشاپردازی میں آورد ہے توانشائیہ نگاری میں آمدہے۔اگرانشاپردازی میں مسجع ومقفیٰ اسلوب اختیارکیاجاتاہے تو انشائیہ نگار ی میں سادہ اورہلکا پھلکا ۔انشاء پردازی میں مشکل اور بسااوقات نامانوس الفاظ وتراکیب بھی استعمال کی جاتی ہیں اس کے برعکس انشائیہ گاری میں عام فہم اور مانوس الفاظ وتراکیب کا استعمال ہوتا ہے۔انشاپردازی کامقصود مصنف کی علمیت کااظہار ہوتا ہے جب کہ انشائیہ نگاری کاواحد مقصود محض ابلاغ ،مسرت رسانی اوربہجت افزائی ہے۔انشائیہ میں اختصار کو ملحوظ رکھاجاتاہے جب کہ انشاپردازی میں بے جا طوالت اور غیرضروری تفصیلات سے کام لیا جاتا ہے۔انشائیہ نگار کا انداز غیررسمی ہوتاہے جب کہ انشاپرداز تکلفات ، عبارت آرائی،قافیہ پیمائی اورغیررسمی لفاظی سے کام لیتاہے اور مخصوص ڈھانچے،آغاز اور اختتام کے خاص اندازورسوم کا پابند ہوتا ہے۔انشائیہ نگارذاتی تجربات اورانفرادی محسوسات کے اظہار کومقدم رکھتاہے جب کہ انشاء پردازکی زیادہ توجہ عموماً خارجی منظرنگاری کی طرف ہوتی ہے۔انشائیہ ایک صنف ہے اورانشاء پردازی ایک اسلوب۔اس بات کے کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ انشاپردازی نے انشائیہ نگاری اور اس کے اسلوب دونوں کو متاثرکیاہے۔تخلیقی نثر اور تازہ کاری جوجدید انشائیے کی اہم خصوصیات ہیں انشاپردازی سے متاثر ہیں ۔اس لیے یہ نہیں کہاجاسکتاکہ اردوانشائیہ صرف Essayیا Essai سے متاثر ہےاوراردویا فارسی وعربی کا کچھ حصہ نہیں ۔

انشائیہ نگاری اور انشاء پردازی میں ایک اورمشابہت موضوع کو کئی زاویوں سے پیش کرنے کاانداز بھی ہے۔انشاء پردازی میں موضوع کو الفاظ اور پیرائے میں تبدیلی کے ذریعے کئی زاویوں سے دیکھاجاتاہے لیکن انشائیہ نگاری میں یہ عمل فکری سطح پر بات کی تبدیلی سے کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں مشتاق قمر رقمطرازہیں :

"اردو ادب میں انشاء پردازی اور انشائیہ نگاری دو مختلف اصطلاحیں ہیں لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے جس کے باعث اس نئی صنف (انشائیہ) کے بارے میں بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔"[8]

انشائیے کا اسلوب

انشائیے کا اسلوب کیسا ہونا چاہیے؟ اس کے متعلق مشتاق قمر رقمطراز ہیں: "اسلوب کی شگفتگی انشائیے کا ایک لازمی جزو ہے لیکن شگفتگی اسلوب کو "چہل"، "ٹھٹھہ"، یا "مزاح" کے ہم پلہ گرداننا درست نہیں کیونکہ یہ اصطلاحیں مزاح مقصود بالذات کے زمرے میں آتی ہیں جب کہ انشائیہ نگار کا مقصد مزاح پیدا کرنے کی جبری یا شعوری کوشش ہر گز نہیں ہوتا۔" [9]

طنز و مزاح اور انشائیے میں فرق

طنز نگاری اور مزاح نگاری جنہیں بعض لوگ ادب کی اصناف سمجھتے ہیں در حقیقت یہ اصناف کے بجائے اوصاف ہیں۔ یہ اوصاف کسی بھی مضمون، کالم، کہانی، انشائیے، افسانے یا ڈرامے وغیرہ میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ جس ادیب کی تحریر میں طنز غالب ہو وہ طنز نگار اور جس کی تحریر میں مزاح کا عنصر غالب ہو وہ مزاح نگار کہلاتا ہے۔ البتہ الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مضمون سراسر طنزیہ ہو یا مزاحیہ۔ یہاں اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ کہیں کسی انشائیے میں ان دو میں سے کسی ایک وصف کا غلبہ ہو جائے تو وہ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون تو کہلا سکتا ہے انشائیہ نہیں۔ انشائیہ نہ تو طنز نگار کی طرح کسی کی جبیں پر سلوٹیں لاتا ہے اور نہ مزاح نگار کی طرح قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ انشائیہ ہنسائے بھی تو زیادہ سے زیادہ مسکراہٹ لا سکتا ہے ورنہ اندر ہی اندر محظوظ و مسرور کر دیتا ہے۔ اخراجِ جذبات کے معاملے میں بھی ظرافت، طنز اور انشائیہ کا الگ الگ کردار ہے۔ طنزیہ تحریر جذبات کو بھڑکاتی ہے اور مزاحیہ تحریر انہیں سرد کرتی ہے۔ جب کہ انشائیہ انہیں اعتدال پر لاتا ہے۔ اور جذبات کا یہ اعتدال ایک شگفتہ انداز لیے مسرت بکھیرتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں مشتاق قمر لکھتے ہیں" طنز نگار غلو کی زبان استعمال کرتا ہے اور مزاح نگار لفظوں کے کھیل سے خیال کی شعبدہ بازی کو عملی جامہ پہناتا ہے۔"[10]

انکشافِ ذات

انکشافِ ذات کا عمل وہ چشمہ ہے جہاں سے انشائیے کے باقی اجزا کی نہریں پھوٹتی ہیں۔اس کا انفرادی نقطۂ نظر اس کے انکشافِ ذات ہی کا عکس ہے۔ لیکن اس کے اپنی ذات کے انکشاف کا خود نوشت سوانح، آپ بیتی یا بیانِ سرگذشت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے تجربات اور محسوسات کے ذریعے زندگی کے جزء یا کل کے متعلق انوکھا اور منفرد نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔اور ذات کا یہی انکشاف کائنات کی ہر چیز کو تفہیم کا نیا پیرہن عطا کرتا ہے۔اس سلسلے میں مشتاق قمر کہتے ہیں "انکشافِ ذات کو غلطی سے موضوع کے بارے میں انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات سمجھ لیا گیا ہے جب کہ حقیقت میں انکشافِ ذات خاص نوع کے تخلیقی احساس کا نام ہے۔"[11]

عدم تکمیل اور اختصار

عدم تکمیل اور اختصار بھی انشائیہ کی دو اہم خصوصیات ہیں۔عدم تکمیل سے مراد موضوع کی غیر سا لمیت اور تشنگی ہے۔اس کی توضیح یہ ہے کہ انشائیہ نگار جب کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو وہ بات سے بات پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور مرکزی بیان کو واضح کیے بغیر دوسری بات چھیڑ دیتا ہے وہ موضوع کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو اس کے شخصی ردِ عمل سے اثر پذیر ہوتے ہیں جب کہ اختصار سے مراد انشائیے کا موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے مختصر ہونا ہے یعنی نہ اس میں دلائل کے انبار ہوں ،نہ لمبے چوڑے وعظ،نہ علمی وفلسفیانہ بحث مباحثہ اور نہ بے جا طوالت ہو یعنی وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ مشاق قمر ان دونوں خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں "عدم تکمیل اور اختصار مضمون کی روح کے منافی اوصاف ہیں۔"[12]

مسرت آفرینی

انشائیے کی ایک خصوصیت قاری کو حظ و مسرت بہم پہنچانا بھی ہے۔وہ یہ کام شگفتگی اور تخلیقی تازگی یا تازہ کاری کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔اس کی تحریر ہلکے پھلکے اور رنگین طرزِ بیاں کی حامل ہوتی ہے جسے پڑھنے سے قاری کا ذہن نہ تو بوجھ محسوس کرتا ہے اور نہ اسے کسی ذہنی ورزش

کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے انشائیوں کی تخلیقی تازگی اورتازہ کاری اسے حظ ، مسرت،بہجت اور سکون فراہم کرتی ہے۔ دنیاوی تفکرات، الجھنوں اورتناؤ کوعلاج میسر آتا ہے۔اور قاری نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تسکین بھی حاصل کرلیتاہے۔جہاں تک شگفتگی کا تعلق ہے یہ فارسی زبان کالفظ ہے جس کا معنی پھول کاکھلنا،خوشی،فرحت وغیرہ کے ہیں۔اصطلاح میں شگفتگی سے مرادکلام بیان کیے جانے والے فرسودہ الفاظ ومضامین کوبھی اس چابکدستی سے پیش کیا جائے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ناگواری وفرسودگی محسوس ہونے کے بجائے خوشگواری وانبساط کا احساس ہو۔شگفتگی کا تعلق لفظ اور معنی دونوں سے ہے۔ کلام میں تہہ داری اور گہرائی نہ بھی ہوجب بھی کسی پہلو سے شگفتگی پیداکی جاسکتی ہے ۔یہ خصوصیت دیگر اصناف میں بھی پائی جاتی ہے مگر انشائیے کی شگفتگی اور دوسری اصناف کی شگفتگی میں ایک نازک فرق ہے جس کی طرف مشتاق قمریوں اشارہ کرتے ہیں"ناول میں شگفتگی اسلوب اورانکشافِ ذات کا مظاہرہ توکیاجاسکتاہے لیکن ناول انشائیے کے دیگراوصاف(غیر رسمی طریقِ کار،عدم تکمیل اوراختصار)کا متحمل نہیں ہوسکتاہے۔"[13] چنانچہ مشتاق قمرمزاح اور شگفتگی کا تقابل پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں"یوں سمجھ لیجیے کہ دریامیں کوزے کوبند کرنے کی سعی مزاح کہلائے گی جبکہ کوزے میں دریابند کرناخالص انشائی عمل ہے۔"[14]

غیر رسمی طریقِ کار

غیر رسمی طریقِ کارانشائیے کی وہ خصوصیت ہے جواسے مضمون سے بالکل الگ کردیتی ہے۔ مضمون میں موضوع سے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں مگرانشائیہ میں موضوع سے جڑی ہر بات چاہے بے ربط ہی کیوں نہ ہوبیان کی جاسکتی ہے۔ مضمون میں مضمون نگارایک موضوع کی چاردیواری میں قید ہوتاہے جب کہ انشائیے میں آزادی ہوتی ہے۔ مضمون میں مواد کی پیشکش میں ایک منطقی ربط ہوتاہے۔انشائیہ کے موضوع کاانشائیے کے تمام مواد سے ربط و تعلق تو ہوتاہے لیکن غیر منطقی اور غیر رسمی۔چنانچہ مشتاق قمرلکھتے ہیں"اسی طرح غیر رسمی طریق کارواعظ،مقرراور شیخ جی کے اندازِ گفتگوسے الگ تھلگ اپنی پہچان رکھتاہے۔۔انشائیہ نگارغیر رسمیت کے باوجودادبی اصولوں اوراقدارسے انحراف نہیں کرتا۔"[15]

مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ

مشتاق قمر کا شمار نہ صرف اردو کے اولین انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے بلکہ وہ اردو انشائیہ کے اولین نقادوں میں سے بھی ایک ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "مشتاق قمر انشائیے کی اصل روح کو پہچانتے ہیں اور زندگی کی ایک قاش کو کل سے الگ کر کے اس پر ایک ایسے نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔"[16] ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں "میرے لیے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ مشتاق قمر اردو انشائیہ کا بیکن ہے یا چارلس لیمب لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے جس صنفِ ادب کو متعارف کرایا تھا اسے ایک عمدہ تخلیق کار مل گیا ہے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اب کچھ اور چراغ روشن ہوں گے اب کچھ اور روشنی پھیلے گی"[17] پروفیسر جمیل آذر کہتے ہیں "مشتاق قمر ہمارے اردو انشائیہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔اس کے ہاں زندگی کے پیش پا افتادہ موضوعات سے انشائیہ کی قندیلیں روشن ہوئی ہیں چھڑی، آئس کریم کھانا، اور بال کٹوانا معنی آفرینی کے عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ "[18] عارف عبدالمتین مشتاق قمر کی کتاب "ہم ہیں مشتاق" پر لکھے گئے فلیپ میں لکھتے ہیں۔"مشتاق قمر کے انشائیوں کی ایک اور اہم صفت یہ ہے کہ ہر چند وہ فلسفہ آرائی سے مملو نہیں ہوتے تاہم ہمیں ان میں ایک خاص نوعیت کے فلسفیانہ اسلوبِ تدبر کا احساس ہوتا ہے جو انہیں رفعت تو عطا کرتا ہے مگر ان کی اس جذباتی یافت کو قطعاً مجروح نہیں ہونے دیتا جسے ان کے ہر انشائیے کے لوازمہ کی حیثیت حاصل ہے۔"[19] مشتاق قمر کے انشائیے اردو انشائیہ تحریک کا آغاز ہیں۔اردو ادب میں وزیر آغا کے بعد دوسرے انشائیہ نگار مشتاق قمر تھے جن کے انشائیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں کی عمارت مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ کی بنیاد پر رکھی البتہ انہوں نے اس کے میٹیریل میں اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبان و ادب کا بھی اضافہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں کے اسلوب پر اردو انشاء پردازی کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

مشتاق قمر کا تخلیقی عمل سست رو رہا جس کی وجہ ان کے مشاہدات ہیں جنہیں وہ انشائی اسلوب میں لانے کے لیے جلدی نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیے تخلیقی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔مشتاق قمر کے انشائیوں کا ہلکا پھلکا اور لطیف انداز اپنے اندر معنوی گہرائی اور بے حد کشش رکھتا ہے۔ان کا انشائیہ زندگی کے کسی ایسے چھوٹے سے پہلو کو جسے عام آدمی غیر اہم سمجھتا ہے ذرہ سمجھ کر پکڑتا ہے اور ستارہ بنا کر ادب کے آسمان پر ٹانک دیتا ہے۔مشتاق قمر

نے ایسی معمولی اور غیر اہم باتوں یا اشیاء کو موضوع بنایا ہے جن میں نکتہ آفرینی اور ندرتِ خیال کی گنجائش نکالنا کسی غیر انشائیہ نگار کے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔ "آئس کریم کھانا"، "بال کٹوانا"، "چھڑی"، "بیٹھنا"، "بھول جانا"، "بلاوجہ"، "ریزگاری"، "خوش فہمی" وغیرہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں میں مانتین کے انشائیوں کے فنی و موضوعاتی لوازم اور خصوصیات کی تقلید کس حد تک کی ہے۔

انکشافِ ذات:

انکشافِ ذات مانتین کے انشائیوں کی سب سے اہم خصوصیت ہے یہاں تک کہ اگر انشائیے میں یہ خصوصیت یعنی انکشافِ ذات موجود نہ ہو تو انشائیے کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کا انکشاف اور مشاہدہ کر کے در حقیقت وہ کائنات کا مشاہدہ اور اس کا انکشاف کرتا ہے۔ ان انشائیوں میں خارجی واقعات اور فکر انگیز گفتگو کے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی شخصیت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

مانتین سے متاثر مشتاق قمر نے بھی اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کا انکشاف اور اپنی شخصیت کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ ان کے انشائیوں سے لی گئی چند مثالیں دیکھیے:

> "میں اتنا غیر معقول بھی نہیں کہ ہر قسم کے جواز کو زندگی سے خارج کر دوں۔ کسی چیز کے لیے کوئی جواز بھی میسر آجائے تو یہ بری بات نہیں لیکن جواز کو مقصود بالذات سمجھ لینے سے بہت سی برائیاں جنم لینے لگتی ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ نہ صرف شادیاں بھی ہم جہیز کی خاطر کرنے لگتے ہیں بلکہ انتہائی خلوص سے پیش کی جانے والی چائے کی ایک پیالی کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"[20]

سطور بالا میں وجہ اور جواز کے موضوع کے وسیلے سے مشتاق قمر نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنے مشاہدات اور محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ یہی اظہارِ ذات ہے جو مانتین کے تصورِ انشائیہ کی خاص بات ہے۔ ان کے مشہور انشائیے "چھڑی" کا یہ اقتباس دیکھیے:

چھڑی کی معیت میں مجھے اپنی غیر متوازن حالت سے چھٹکارا ملا ہے اور یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں کسی آشرم میں پہنچ گیا ہوں یا مزکسی چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگرانداز ہونے کے بعد خراب ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اپنے اندر ایک عجیب سے جذبہ افتخار کی کلبلاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ اور جدا ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑا پاتا ہوں اور کوئی شے مجھے ایک زوردار تقریر کرنے پر اکسانے لگتی ہے۔"[21]

اقتباسِ بالا میں مشتاق قمر نے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق چھڑی سے سہارا لینے کے تجربے کو بیان کیا ہے۔ اور انسانی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ چھڑی بالعموم ہر انسان کو اور بالخصوص بوڑھے لوگوں کو کتنا پر اعتماد بنا دیتی ہے۔ انسان اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے بغیر اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہے۔ یا جس طرح تسبیح ہاتھ میں لینے سے ذکر کرنے کو من کرتا ہے۔

2۔ بے ربطی/منتشر الخیالی

بے ربطی سے مراد انشائیہ نگار کی منتشر الخیالی ہے۔ مشیل دی مونتین کے انشائیوں میں بے ربطی ایک اہم صفت کے طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بظاہر موضوع سے دور ہوتا، کبھی دوسرے موضوعات کو چھیڑتا اور کبھی ایک بات نامکمل چھوڑ کر دوسری بات شروع کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضوع سے اس کا ایک مخفی ربط بھی قائم ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ مثلاً بھول جانے کے موضوع پر لکھتے لکھتے وہ یوں لکھنا شروع کر دیتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ مکمل ذہنی اور جسمانی آزادی یہاں سے لاکھوں میل کی بلندی پر خلائی جہاز میں کوئی نقص پیدا کر کے بھی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اول تو یہ سودا قدرے مہنگا پڑتا ہے۔"[22]

ایک اور انشائیے "لونا نہم" (جس میں چاند پر جانے والے خلائی جہاز لونا نہم کو اور دنیا کا سفر کرنے والے ایک تصوراتی سیاح کے سفر نامے کو موضوع بنایا گیا ہے۔) میں مرقوم یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

"میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جو پہلے بھی کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور اب بھی کرائے کے مکان میں اقامت پذیر ہیں۔"[23] (اور پھر ایک مکان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔)

مر قومہ بالا جملے میں انشائیے کے موضوع سے انحراف کیا گیا ہے جو ایک مضمون میں ہو تو خامی ہے لیکن انشائیے کے ہاں یہ ایک خوبی تصور کی جاتی ہے۔اب اگر پورے انشائیے کو ملاحظہ فرمائیں تو اس بے ربطی اور منتشر الخیالی کے باوجود یہ پیرا گراف انشائیے کا حصہ ہی دکھائی دے گا۔

اپنے انشائیے "بال کٹوانا" میں بالوں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے کتابوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں:

> "کتابوں کا مطالعہ نئی تہذیب کی کسوٹی ہے۔ابھی تک تو کتابوں کے متعلق جمہوری طریقہ رائج ہے، یعنی انہیں گنتے ہیں تولتے نہیں لیکن زمانے کے انداز بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔دو واضح طبقے پیدا ہو گئے ہیں ایک طبقہ اپنی تصانیف کی ضخامت کو کم سے کم اور دوسرا زیادہ سے زیادہ کرنے کی طرف مائل ہے۔"[24]

اقتباسِ بالا میں بال کٹوانا کے موضوع کو چھوڑ کر کتابوں پر بات بظاہر بے ربط نظر آتی ہے مگر مذکورہ انشائیہ مکمل طور پر پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ نئی تہذیب پر گفتگو میں بال کٹوانے اور کتابیں پڑھنے میں تبدیلی کا عمل مشترک ہے۔

اپنے انشائیہ "میرا کتب خانہ" کا آغاز یوں کرتے ہیں:

> "بادلوں کے کئی روپ ہیں۔لیکن مجھے بادلوں کا بس ایک ہی روپ پسند ہے جس میں بادل ہلچل اور بے قراری سے معمور چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بٹ کر میرے لیے معانی اور مطالب کے نئے نئے باب کھول دیتے ہیں۔آسمان ایک طویل و عریض کتب خانہ اور بادلوں کے چھوٹے بڑے رنگ برنگے ٹھکڑے ارزاں پیپر بیک یا قیمتی مجلد کتب کا روپ دھار لیتے ہیں۔"[25]

اب آگے بڑھتے ہوئے وہ بادلوں، فضا اور ماحول کی منظر کشی کرنے اور اس موضوع کو آگے بڑھانے کے بجائے مطالعہ کتب اور اپنے کتب خانے کو موضوعِ سخن بنا لیتے ہیں۔

3۔ غیر رسمی انداز یا طریقِ کار

مانتین انشائیے کو جہاں سے چاہتا ہے شروع کر دیتا ہے اور جہاں پر چاہتا ہے ختم کر دیتا ہے۔ نہ تمہید نہ تفصیل، نہ ربط نہ تکمیل اور نہ ماحصل وغیرہ۔ اسی خصوصیت کو غیر رسمی انداز کہا جاتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

انشائیہ "دھوپ کھانا" کا آغاز دیکھیے:

> میں نے اس بات کا کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ دھوپ کھانے کے فن میں صرف میں ہی یکتائے روزگار ہوں۔"[26]

اب اسی انشائیے کا اختتامہ جملہ ملاحظہ فرمایئے:

> یہ "بانس اور بانسری کا سارا کھیل "اس "دھوپ" ہی کے دم قدم سے ہے۔ جس کی آنکھوں میں ڈال کر دیکھنے کی میرے سوا آج تک کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔"[27]

مذکورہ بالا انشائیہ کا آغاز اور اختتام ملاحظہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس انشائیے کی نہ تو کوئی تمہید ہے نہ موضوع کی تفصیلات دی گئی ہیں، نہ پیروں کا باہم ربط ہے نہ انشائیے کی تکمیل ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی ماحصل ہی دیا گیا ہے۔ یہی انشائیہ اور مضمون میں نمایاں فرق ہے۔

انشائیہ "کوہ پیمائی" کے ابتدائی اور آخری جملے دیکھیے:

ابتدائی جملہ: "کوہ پیمائی دنیا کی واحد حقیقت ہے جو صرف تصویر کی حد تک درست ہے۔"[28]

آخری جملہ "ان کا آگے بڑھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اور ایک بار نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد دوبارہ کوئی بھی انہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ صرف ان کی تصاویر ہی ان کی یاد دلانے کو رہ جائیں گی۔"[29]

مرقومہ بالا اقتباسات کے غیر رسمی انداز یا طریقِ کار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تحریریں انشائیہ کی صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔

انشائیہ "بلاوجہ" کا آغاز دیکھیے:

"مجھے اس امر کا پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ انسان اس قدر عقلیت پسند ہو گیا ہے کہ چائے کی ایک پیالی بھی بلاوجہ پی پلا نہیں سکتا۔"[30]

اب اختتامی جملے کو پڑھیے۔ آپ کو غیر رسمی انداز صاف دکھائی دے گا۔

"ہر چیز اور ہر بات کے لیے جواز کی تلاش معقول رویہ نہیں ۔۔۔ آخر اس دنیا میں خود انسان کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟"[31]

4۔ عدم تکمیل

مانتین کے انشائیوں میں پائی جانے والی عدم تکمیل کی خصوصیت اس کے موضوعات میں غیر سالمیت اور ایک خاص تشنگی کو برقرار رہتی ہے۔ وہ اپنے قاری کے راہوارِ فکر کو مہمیز کرنے کے لیے اختتامی جملے کو استفہامیہ بنا دیتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیے بھی عدم تکمیل کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

اپنے انشائیے "بلاوجہ" کا اختتام اس جملے پر کرتے ہیں۔ "ہر چیز اور ہر بات کے لیے جواز کی تلاش معقول رویہ نہیں ۔۔۔ آخر اس دنیا میں خود انسان کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟"[32]

مندرجہ بالا اقتباس میں مشتاق قمر نے انشائیہ تو مکمل کر دیا مگر قاری کو اس موضوع کا اختتام سوچنے کے لیے ایک ایسائنمنٹ بھی دے دی۔

انشائیے "شہرت کی مخالفت میں" کا آخری جملہ ملاحظہ کیجیے:

"لیکن خدا لگتی کہیے اگر آپ آج سے چند صدیاں پیشتر پیدا ہو کر کامیابی کے ساتھ ساحلِ شہرت پر لنگر انداز ہو گئے ہوتے تو کیا آپ اپنے تعویذِ لحد کے آس پاس اس قسم کی ہڑبونگ کو آسانی سے برداشت کر سکتے تھے؟"[33]

اگر غور کریں تو اس انشائیے کا اختتام ایک نئے انشائیے کا آغاز ہے۔

"اگر آپ اس سے بھی بڑھیا قسم کا سچ سننے کے موڈ میں ہیں تو میرے خیال میں اپالوٹریجڈی کی اصل وجہ یہ ہے کہ تاریخِ انسانی کے اس عظیم حادثہ کے دن جب میں ریڈیو پر خبریں سننے کے لیے

ڈرائینگ روم کی طرف جارہاتھامیراراستہ مانونے کاٹ لیاتھااوربدقسمتی سے مانوکارنگ کالاہے۔کاش میں اس دن خبریں سننے کاارادہ ہی ملتوی کر دیتا۔"[34]

مندرجہ بالاجملہ مشتاق قمرکے انشائیہ "اپالوٹریجڈی" کااختتامی پیراگراف ہے ۔حالانکہ توہمات اورسائنس کاموضوع(جواس انشائیے کاموضوع ہے)ابھی تشنہ تکمیل ہے۔

5۔ متنوع موضوعات

مانتین کے تصورِانشائیہ کے مطابق انشائیہ نگار کے انشائیے متنوع موضوعات پر تحریر ہونے چاہییں۔جس طرح وہ "اداسی"، "غم"، "ناراضی"، "خوف"، "غصہ"، "نفع"، "دیانت"، "دوستی"، "سینیکا"، "پلوٹارک کا دفاع"، "عدم اطمینان"، "جھوٹ"، "امراض"، "قسط"، "عمر"، "خوف"، "ناراضگی"، "تخیل"، "دوستی"، "کینیڈا"، "طلاق"، "گفتگوکافن"، "مسکراہٹ"، "توبہ"، "دریافت"، "کافر"، "جسمانی معرفت"، "تجربات"، "کتابیں"، "بدقسمتی سے"، "جھوٹ"، "ضمیر کی آزادی""، "مجرم"، "ایک بدمعاش بچہ" وغیرہ جیسے موضوعات پر قلم اٹھاتاہےاورانہیں شاداب،تازہ اور رنگا رنگ بنادیتاہے۔مشتاق قمرنے انشائیے کے اس مانتینی اصول کی تقلید کرتے ہوئے رنگارنگ اور متنوع موضوعات پر انشائیے لکھے۔ذیل میں ان کے انشائیوں کے موضوعات دیکھیے:

"بال کٹوانا"، "چھڑی"، "بیٹھنا"، "آئس کریم کھانا"، "دھوپ کھانا"، "تبدیلی نام"، "کوہ پیمائی"، "لونانہم"، "بھول جانا"، "بڑھاپا"، "اپالوٹریجڈی"، "کچھ نیند کی مذمت میں"، "شہرت کی مخالفت میں"، "مرزاغالب--زندگی کی ساتویں جہت"، "میراکتب خانہ"، "پھل کھانا"، "بلاوجہ"، "خوش فہمی"، "ریزگاری"، "اقبال کی ایک تصویر"، "مسئلہ یہ ہے" وغیرہ۔

انشائیہ نگار کے انشائیے متنوع موضوعات پر تحریر ہونے چاہییں۔کائنات کی کسی چیز،مظہر،خیال یاجذبے کوموضوع بنایاجاسکتاہے۔مشتاق قمر جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اسے شاداب،تازہ اور رنگارنگ بنادیتے ہیں۔مشتاق قمرنے متنوع اور بوقلموں موضوعات پرانشائیے لکھے۔

6۔ اختصار/کفایتِ لفظی

مانتین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔اس کے انشائیے موضوع کے لحاظ سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی مختصر ہوتے ہیں۔نہ اس میں دلائل کے انبار، نہ لمبے چوڑے وعظ، نہ علمی و فلسفیانہ بحث مباحثہ اور نہ بے جا طوالت ہوتی ہے۔وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرتا ہے۔مشتاق قمر کے اکثر انشائیے اختصار کی اس خصوصیت سے محروم ہیں۔ان کے اکثر انشائیے بالخصوص "بال کٹوانا"، "لونا نہم" اور "اپالوٹریجڈی" وغیرہ طوالت کا شکار ہو گئے ہیں۔البتہ مشتاق قمر کے انشائیوں میں طوالت کے باوجود کفایتِ لفظی سے کام لیا گیا ہے۔آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک ہی انشائیے میں بیک وقت طوالت اور اختصار کے موجود ہونے کا کیا مطلب ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ان انشائیوں کے طویل ہونے کی وجہ مصنف کی موضوع کے زیادہ سے زیادہ گوشوں کو سامنے لانے کی خواہش ہے۔ورنہ ان انشائیوں کا ہر گوشہ اپنی جگہ اختصار اور کفایتِ لفظی کا حامل ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان طویل انشائیوں میں بھی قاری بور نہیں ہوتا بلکہ اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔چنانچہ میں یہ کہوں گا کہ مشتاق قمر کے انشائیوں میں طوالت کا ہونا ان کی خامی نہیں ہے بلکہ انشائیے میں ان کا اجتہادی کارنامہ ہے۔دوسری طرف ان کے متعدد مختصر انشائیے بھی موجود ہیں جن میں سے "بلاوجہ"، "ریزگاری"، "خوش فہمی"، "بڑھاپا"، "کچھ نیند کی مذمت میں" وغیرہ اختصار کے مانتینی اصول کے عین مطابق ہیں۔دراصل زمانی ترتیب سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کی انشائیہ نگاری کا سفر جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں اختصار، کفایتِ لفظی اور فنی پختگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

7۔ مسرت آفرینی

مانتین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت مسرت آفرینی اور بہجت افزائی ہے۔اس کی تحریر پڑھ کر قاری پر تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اور قاری نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تسکین حاصل کرتا ہے۔یہی وہ کیفیت ہے جسے شگفتگی کہتے ہیں جو درحقیقت تخلیقی نثر اور تازگی کا امتزاج ہوتا ہے۔

مانتین کے انشائیوں میں پائی جانے والی شگفتگی مزاح و ظرافت کی شگفتگی سے الگ تھلگ ہے۔طنز و مزاح کی شگفتگی مسرت کو قہقہوں میں اڑا دیتی ہے۔بلکہ کبھی کبھی تو ہنستے ہنستے قاری کے آنسو بھی نکل آتے ہیں اور اس کے

ساتھ ہی قاری جذبات سے خالی اور بے کیف ہو جاتا ہے۔ لیکن انشائیے میں پائی جانے والی شگفتگی قاری کو تبسم زیرِ لب یا پسِ لب کے ذریعے بڑی دیر تک مسرت و بہجت عطا کرتی ہے۔اسے وزیر آغا تخلیقی تازگی کا نام دیتے ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کے موضوع اور اسلوب دونوں میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"سکوں کی نغمگی کا اعلیٰ نمونہ آج کے بھکاری کی گدڑی ہے کہ اس میں نہ صرف لاکھوں کی دولت پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ راسخ العقیدہ رکھنے والوں کے لیے روحانی تشنگی کے وافر سامان بھی ہوتے ہیں۔آپ بھکاری کے سوا دنیا کے ہر انسان کو پند و نصائح اور زجر و توبیخ سے اس کا آبائی پیشہ ترک کر دینے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو آپ بھکاری سے اس کی گدڑی چھین سکتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی نیا چولا پہننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"[35]

"نیز تہذیب کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر عورت کی تہذیبی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمسری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی عورت ابھی تک تہذیب کے اس شیریں پھل کو چکھ نہیں سکی جسے عرفِ عام میں "گنجے پن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"[36]

"چل اسی جنتِ گم گشتہ کی جانب زندگی کی باگ ڈور موڑ لیں جہاں کی ہر شے اپنی اصلی قدرتی حالت میں قینچی و استرے کی مصنوعی تراش خراش سے بے نیاز ہماری راہ تک رہی ہے"[37]

8۔ گپ شپ کا انداز

مانتین کے انشائیوں کی ایک خاص بات اس کا گپ شپ کا انداز ہے۔اس کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ساری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر پر سکوں ماحول میں دوستوں سے گپ بازی میں مصروف ہے۔اور اسی گپ شپ میں وہ زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں تک کو بیان کرتا چلا جاتا ہے اور یوں کہ دوستوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس گپ شپ میں وہ کیا کچھ سیکھ چکے ہیں۔ یہی پڑھنے والے کو شگفتگی عطا کرتا ہے اور اکتاہٹ نہیں ہونے دیتا۔

مشتاق قمر بھی اپنے انشائیوں میں گپ شپ میں زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں کو بیان کر جاتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"ایک (کامیاب) کوہ پیما کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک ہی بات فخر کا ناعث ہو سکتی ہے کہ نامساعد موسمی حالت میں نسبتاً بلند مقام سے ہو آیا ہے---اول تو یہ کوئی ایسی قابلِ فخر بات نہیں۔ دوئم دوسروں سے سبقت لے جانے کے اور بھی نسبتاً سہل اور مفید ذرائع ہیں --- مثلاً آپ بغیر گدی کے سائیکل پر متواتر اکیانوے گھنٹے سواری کر کے (اب تک نوے گھنٹے کا ریکارڈ ہے) اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔---یا پھر کسی "حسینہ عالم" کو کیریئر پر بٹھا کر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا سکتے ہیں۔۔۔"[38]

اقتباس مرقومہ بالا میں بظاہر گپ شپ لگائی جا رہی ہے مگر یہ گہری بات بھی سمجھائی جا رہی ہے کہ آدمی کی مہم جوئی ہو یا کسی بھی قسم کی جد وجہد اس کا کوئی نہ کوئی ایسا مقصد ضرور ہونا چاہیے جس سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے صرف نام پیدا کرنے کے لیے زندگی داؤ پر لگانا بیکار ہے۔

ملاحظہ کیجیے:

"سکوں کی نغمگی کا اعلیٰ نمونہ آج کے بھکاری کی گدڑی ہے کہ اس میں نہ صرف لاکھوں کی دولت پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ راسخ العقیدہ رکھنے والوں کے لیے روحانی تشنگی کے وافر سامان بھی ہوتے ہیں۔ آپ بھکاری کے سوا دنیا کے ہر انسان کو پند و نصائح اور زجر و توبیخ سے اس کا آبائی پیشہ ترک کر دینے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو آپ بھکاری سے اس کی گدڑی چھین سکتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی نیا چولا پہننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"[39]

مذکورہ بالا اقتباس میں بظاہر انشائیہ نگار گپ شپ لگا رہا ہے لیکن وہ در حقیقت پیشہ ور بھکاری کی فطرتِ ثانیہ بننے والی عادت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے احساس دلا رہا ہے کہ احساسِ ندامت سے محروم شخص کو کسی پیشے کی عزت یا اہمیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

"نیز تہذیب کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر عورت کی تہذیبی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمسری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی عورت ابھی تک تہذیب کے اس شیریں پھل کو چکھ نہیں سکی جسے عرفِ عام میں "گنجے پن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"[40]

مرقومہ بالا اقتباس میں بھی گپ شپ میں کئی گہری باتیں سمجھادی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ فطرت سے ہر جگہ بغاوت نہیں کی جاسکتی۔ ہر چیز کی حقیقی خوبصورتی کا دارومدار اس کا فطری حالت میں ہونا ہی ہے۔

9۔ سبک اسلوب

مانتین کے اسلوب میں مانوس اور ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال عام ہے۔ اس کے انشائیوں میں خارجی خصوصیات یعنی الفاظ کی دروبست، زبان اور رموز وعلائم وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی شخصیت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

مشتاق قمر نے اپنے تحریر کردہ انشائیوں کے اسلوب کی بنیادیں مانتین کے قائم کردہ اسلوب کی بنیادوں پر ہی رکھی ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ عبارت دیکھیے:

بے شک آپ گھٹنے ٹیکیں۔ گز گز بھر لمبی زبان نکالیں۔ آپ کی ہڈی پسلی چکنا چور ہوجائے۔ جسم کا ہر عضو چیخ چیخ کر آپ کی شکست کا اعتراف کرے۔ لیکن جب تک آپ " بیٹھنے" سے دستبردار ہوکر چت نہیں لیٹ جاتے اس بلائے عظمیٰ سے رستگاری پانے کے تمام حربے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔[41]

مرقومہ بالا اقتباس میں ساختی متوازیت، صوتی رمزیت، برجستہ محاورات، تکرارِ لفظی، مانوس الفاظ اور شگفتہ انداز مشتاق قمر کے اسلوب کو نمایاں کرتا ہے۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"انسان کا کام محض دریاؤں، ندیوں کا رخ موڑنا نہیں بلکہ ان کے کنارے نرم نرم ریت پر سر رکھے، دھوپ کی ننھی ننھی شعاعوں کی شال اوڑھے کچھ دیر کے لیے فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونا بھی ہے۔"[42]

جملہ بالا میں صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ واستعارے کے استعمال نے اس جملے کے اسلوب کی دلکشی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ایک اور جملہ ملاحظہ فرمایئے:

"اس وقت آپ کو محسوس ہوگا گویا ستارے ایک عالمِ سوگوار میں ہاتھ مل رہے ہیں۔ چاند کسی کے انتظار میں محوِ حیرت واستعجاب ہے۔ اس کی ضیاپاش نگاہیں تھک چکی ہیں۔ درخت، پتے، ٹہنیاں، لہلہاتے کھیت۔ سڑکیں، پگڈنڈیاں۔ جھرنے چشمے۔ ندی، نالے، دریا۔ فطرت کا ہر عنصر یاسیت اور شکست خوردگی کے احساس تلے کراہ رہا ہے۔"[43]

جملہ بالا میں اسلوبِ ظاہری کی اکثر خصوصیات مثلاً شماریت، صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہات و واستعارات کے استعمال نے اس جملے کے اسلوب کو بے حد دلکش بنا دیا ہے۔ یہ جملہ دیکھیے:

"اس میں پھول بھی کھلتے ہیں۔ کلیاں بھی چٹکتی ہیں۔ درخت سبز سبز جامے بھی اوڑھتے ہیں اور فطرت کا بے رحم ہاتھ ان سے یہ شگوفے اور کلیاں چھین بھی لیتا ہے۔"[44]

جملہ بالا میں ظاہری اسلوبیاتی محاسن صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ واستعارے کے استعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اسلوبیاتی اوصاف یعنی سبک الفاظ کا چناؤ، اور ایک بہار آفریں ماحول کی تخلیق نے عبارت کو مسحور کن بنا دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کا اسلوب مجموعی طور پر دلکش اور منفرد اسلوب ہے۔

10۔ دعوتِ فکر

مانتین کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت قاری کے اسپِ فکر کو مہمیز کرنا اور اسے تحقیق و جستجو کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ مضمون نگار کی طرح قاری کو خود سارا کام کر کے نہیں دیتا بلکہ کچھ کام خود کرتا ہے اور کچھ قاری کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے مثال کے طور پر ان کا انشائیہ "بلاجواز" قاری کو زندگی کے ہر عمل کا جواز ڈھونڈنے یا نہ ڈھونڈنے پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ قاری

کرہ ارض پر انسان کے وجود کے جواز پر بھی سوچنے لگتا ہے۔ اپنے انشائیے "بال کٹوانا" میں وہ عورتوں میں گنجا پن کی خواہش کا نہ ہونے اور محقق قسم کے لوگوں کے سروں پر بالوں کا کم ہونے کی حکمت پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ انشائیہ "تبدیلی نام" میں وہ اس بات پر تدبر کی دعوت دیتے ہیں کہ کیا انسان کے نام بدل لینے سے اس کی فطرت، جسمانی ساخت یا نفسیات پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ انشائیہ "کوہ پیمائی" میں "کوہِ ندا" اور "زرد پہاڑ" کی علامتوں اور ان کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ انشائیہ "لونا نہم" میں اس بات پر سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں کہ کیا درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے والا، چرندوں کی طرح حرام حلال و جائز ناجائز چیزوں کو کھانے، پرندوں کی طرح جہازوں میں اڑنے، سیاروں کی طرف سفر کرنے اور سمندری مخلوق کی طرح بحری جہازوں اور کشتیوں میں سیر کرنے سے ہی انسان اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے یا اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی کوئی اور وجہ ہے؟

بحث مذکورہ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ اردو ادب کی ممتاز صنف "انشائیہ" میں مشتاق قمر نے اپنی انشائیہ نگاری میں رچرڈ سٹیل، جوزف ایڈیسن، میکالے، رسکن، نیومین اور آرنلڈ وغیرہ کے بجائے مشیل دی مانتین کی پیروی کی البتہ اردو انشاپردازی، اپنی دھرتی کی مہک اور پنجاب کی ثقافت کے رنگ ڈال کر اسے زیادہ دلکش اور پرکشش بنا دیا۔

جمیل آذر کا تصورِ انشائیہ

انشائیہ زندگی سے مربوط ہے

جمیل آذر اردو انشائیہ نگاری کا معتبر نام ہے۔ وہ پہلے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے انشائیے کو زندگی سے مربوط کیا۔ وہ انشائیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں "انشائیہ زندگی کی راہوں سے بکھرے ہوئے نفرتوں اور منافقتوں کے کانٹے ہٹا کر پھولوں کی پتیاں بکھیرتا ہے۔ تاکہ انسانیت کی عظمت اور زندگی کا وقار بلند ہو۔"[45] انشائیہ اپنے قاری کو زندگی کے متنوع روپ دکھاتا ہے۔ اس کے جذبہ تحیر کو مہمیز لگاتا ہے۔ اور اسے زندگی میں بھرپور شرکت کی دعوت دیتا ہے۔

انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے

انشائیہ کی لطافت، انفرادیت، اہمیت اور خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں

اپنے اس مخصوص مزاج اور خصوصیات کی بناپر انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے کیونکہ اس میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا سا تاثر، ناول کا سا فلسفہ حیات اور ڈرامے کے سے انتظاریہ لمحات اور ان کے پسِ منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی (symphony) ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشافِ ذات کا عمل جو خاص انشائیہ کے لیے مختص ہے۔ یہی وہ مقتضیات ہیں جن کا انشائیہ میں ہونا ضروری ہے۔ [46]

طنز و مزاح

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ طنز و مزاح کا تعلق کسی ادبی تحریر کے اوصاف سے ہے۔ باقی اصناف کی طرح یہ انشائیے میں بھی برتی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ طنزیہ و مزاحیہ مضمون اور انشائیے کی شگفتگی میں ایک خاص فرق قائم رہے۔ اس ضمن میں جمیل آذر لکھتے ہیں "انشائیہ میں طنز و مزاح کی چاشنی تو مستحسن ہے مگر چھاپ غلط ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر رس بس جانے چاہییں۔" [47] "ایسی صورتِ حال میں منچلے طنز نگاروں نے طنز و تعریض کے تیر برسائے تو مزاح نگاروں نے مضحکہ ٹوپی پہن کر ہمیں ہنسنے ہنسانے پہ مجبور کیا کہ افسردگی اور گھٹن سے بچنے کا یہ اچھا علاج ہے۔ [48]

انشائیہ کی انفرادیت اور معتدل مزاجی

جمیل آذر کے نزدیک انشائیہ اردو نثر کی اصناف میں اپنی معتدل مزاجی اور تازگی کے لحاظ سے منفرد ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "انشائیہ اپنے معتدل مزاج کے ساتھ بساطِ ادب پر اپنی ننھی سی انفرادی شمع روشن کرتا ہے تاکہ دھند اور کہر میں لپٹی ہوئی ویرانی میں زندگی کے حسن کی جلوہ نمائی کرے اور زندگی پر سے اٹھتے ہوئے اعتماد کو بحال کرے۔" [49]

مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں جمیل آذر کے انشائیوں کا موضوعاتی جائزہ

مشتاق قمر اور جمیل آذر وہ توانا بازو تھے جن کی مدد سے ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ کی تحریک چلائی۔ البتہ مشتاق قمر افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ بھی لکھتے رہے مگر جمیل آذر بنیادی طور پر انشائیہ نگار اور خالص انشائیہ نگار تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں: "پروفیسر جمیل آذر کا شمار اردو کے ان اولین انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف انشائیہ فہمی کے لیے زمین ہموار کی بلکہ بے حد خوبصورت انشائیے لکھ کر آنے والوں کے لیے ایک درخشاں مثال بھی قائم کر دی"[50] ن کی انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر بشیر سیفی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں "مجموعی طور پر جمیل آذر کے انشائیے اپنی بے ساختگی، شگفتگی، کھلی کھلی کیفیت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔"[51] جمیل آذر کی کتاب "رت کے مہمان" کے دیباچے میں ڈاکٹر رشید امجد کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے "انہوں نے اردو کو ایک موضوعاتی رخ عطا کیا جس سے انشائیہ میں معنوی اور فکری وسعت ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ موضوعاتی دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔"[52] جمیل آذر کا انشائیہ مضمون یا مقالے کی طرح منطقی یا استدلالی تحریر نہیں ہوتی بلکہ معاشرے اور ان کی اپنی زندگی کے تعلق سے ذاتی تجزیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اظہار سادہ اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس میں حکمت و فلسفہ کے ساتھ ساتھ کسی حد تک طنز و مزاح بھی ہوتی ہے لیکن وسیلے کے طور پر ہی۔ نیز ان کا طنز نشتر زنی کی بجائے مرہم کا کام کرتا ہے۔ جمیل آذر کا انشائیہ روح کو تازگی، دل کو انبساط اور ذہن کو مسرت فراہم کرتا ہے۔ بلیغ بات کو جامع اور مختصر شکل میں پیش کرنا جس میں شگفتگی اور تازہ کاری کا عمل جاگزیں ہو ان کے انشائیوں کا کمال ہے۔ ان کے انشائیوں میں حقیقت کا اظہار، شخصی رد عمل، اختصار، عدم تکمیل، رمزیت و اشاریت، غیر منطقی ربط، کفایتِ لفظی، دعوتِ فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، زبان و بیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر کر کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش ان کے انشائیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں غمگیں دلوں کی شگفتگی کا سامان بھی ہے اور خشک خیالات کے بجائے دلکش پیرایہ اظہار بھی۔

آیئے دیکھیں کہ جمیل آذر نے اپنے انشائیوں میں مانتین کے انشائیوں کے فنی و موضوعاتی لوازم اور خصوصیات کی کس حد تک پیروی کی ہے۔

1۔ انکشافِ ذات

جیسا کہ مشتاق قمر کے انشائیوں کے جائزے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ انکشافِ ذات مانتین کے انشائیوں کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ مانتین کی طرح جمیل آذر کے انشائیوں میں بھی انکشافِ ذات واضح نظر آتا ہے۔ لیکن جمیل آذر انکشافِ ذات کرتے ہوئے متکلم کی بجائے غائب کا صیغہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہلے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے انشائیہ کو زندگی سے مربوط کیا ہے۔ محمد اسد اللہ رقمطراز ہیں:

> لیکن جو چیز جمیل آذر کی امتیازی خصوصیت قرار دی جا سکتی ہے وہ عصری زندگی کے مظاہر کی پیش کش سے ایک قدم آگے بڑھ کر روحِ عصر تک رسائی کی وہ کوشش ہے جہاں فن کو اعلیٰ معیار اور دوامی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جو فن کا مطمحِ نظر بھی ہے کہ دراصل تیسری آنکھ کی کارفرمائی بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔[53]

جمیل آذر نے بھی اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کا انکشاف اور اپنی شخصیت کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ ان کے انشائیوں سے لی گئی چند مثالیں دیکھیے:

> "جونہی میں کسی نیم پلیٹ کو پڑھتا ہوں تو مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بہت جلد محبت یا نفرت، دوستی یا دشمنی میں بدل جاتی ہے۔ جب میں اس قبیل کی کوئی نیم پلیٹ دیکھتا ہوں جس پر اسمِ گرامی یوں لکھا ہوتا ہے:
>
> "جناب ع غ صاحب زادہ یا نواب زادہ یا پیر زادہ۔"
>
> تو مجھے ان صاحب کی کم مائیگی اور تہی دامنی پر ترس آنے لگتا ہے کہ بے چارے خود تو کمال حاصل نہ کر سکے اور اب بزرگوں کے نام سے شہرت کے طلب گار ہیں۔[54]

اقتباسِ بالا میں جمیل آذر نے نیم پلیٹ کے حوالے سے خود ستائی اور نمائش کے دلدادہ لوگوں کے بارے میں کیے گئے مشاہدے کو بیان کرتے ہوئے اپنی ذات کا اظہار کیا ہے۔ جو اس تحریر کو انشائیہ ثابت کرتا ہے۔

ایک اور انشائیے سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھیے:

صبح کا تازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔ میرے کان اس کی ہلکی سی جنبش کو بن دیکھے پہچان لیتے ہیں۔ جس خندہ پیشانی سے یہ میرے کمرے میں نزولِ اجلال فرماتا ہے میں اسی بے اختیاری کے ساتھ بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور پھر چائے کے گرم شیریں گھونٹوں کے ساتھ اس کی فتنہ پردازیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔[55]

اقتباس مرقومہ بالا میں جمیل آذر نے نہایت شگفتہ اور بے تکلف انداز میں اخبار کے مطالعے کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اخبار کے بارے میں اپنی پسند اور دلچسپی کی کامیاب لفظی تصویر کشی کی ہے۔ ذات کے اظہار کا یہ انداز ہی انشائی انداز ہے۔ ان کے ایک اور انشائیے سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھیے:

"مجھے جمہوری نظام اس لیے پسند ہے کہ یہ ہمیں شرکت و شمولیت کی کھلے بندوں دعوت دیتا ہے جبکہ غیر جمہوری نظام ہم سے روحانی، جذباتی اور فکری شمولیت کا حق چھین لیتا ہے اور ہمیں لاتعلقی اور عدم دلچسپی کے صحرا میں عضوِ معطل کی طرح پھینک دیتا ہے۔ زندگی اور موت میں یہی فرق ہے کہ زندگی نام ہے شمولیت کا جبکہ موت نام ہے عدم شمولیت کا۔"[56]

جمیل آذر جمہوریت کے بارے میں اپنی ذات کا انکشاف کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ جمہوریت مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں عوام الناس میں سے ہر شخص کی شمولیت ہوتی ہے جب کہ آمریت میں عام لوگوں کی مرضی نہیں چلتی۔

2۔ بے ربطی

جمیل آذر کے انشائیوں میں پائی جانے والی بے ربطی دراصل مانتین ہی کے تصورِ انشائیہ کی دین ہے۔ انشائیے کی بے ربطی دیکھیے کہ جمیل آذر انشائیے "اخبار پڑھنا" میں کیسے اخبار کے موضوع پر ذکر کرتے کرتے کتاب کو موضوع بنا لیتے ہیں:

کتب خوانی تحصیلِ علم و آگہی کے لیے ایک عظیم و پروقار فعل ہے لیکن میں اس کٹھن اور دقت طلب فعل سے نجات پانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں۔ کتاب کے مطالعہ سے پہلے بڑی صبر آزما منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کون سی کتاب پڑھنے کے قابل

ہے؟ پھر کتاب کی قیمت اور اپنی جیب کی اجازت کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کن ضروریاتِ زندگی کو مار کر اس اعلیٰ ذوق کی تسکین کی جائے۔[57]

ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح وہ اپنے انشائیے "نیم پلیٹ" میں نیم پلیٹ پر گفتگو کرتے کرتے روئے سخن سائن بورڈوں کی طرف موڑ دیتے ہیں:

"خدا بھلا کرے ان موجدوں کا جنہوں نے نیون لائٹ کی ایجاد سے اشتہار بازی یا سازی کے شوق کو اتنا فروغ بخشا کہ رات کی گھمبیر تاریکی میں یہ جگمگ کرتے سائن بورڈ راہ گیر کی توجہ اس طرف اپنی جانب منعطف کرتے ہیں جس طرح کوئی حسین اور چنچل دوشیزہ اپنے اندازِ دلربائی سے۔۔۔"[58]

ایک اور انشائیے "مچھلی کا شکار" میں کہ بات مچھلی کے شکار پر ہو رہی ہوتی ہے کہ اچانک وہ لفظ "چانس" کو موضوعِ گفتگو بنا لیتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

"لیکن جہاں تک چانس والے معاملہ کا تعلق ہے میں مرزا صاحب سے سو اسولہ آنے متفق ہوں مگر ٹھہریے! کیا ہم چانس کی سحر کاری کو اپنی زندگی سے جلاوطن کر سکتے ہیں؟ کیا مرشد صاحب سے میری دوستی چانس کی مرہونِ منت نہیں؟ کیا ہمارا کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آنا بذاتِ خود چانس کا کرشمہ نہیں؟" [59]

3۔ غیر رسمی طریقِ کار

انشائیہ "مچھلی کا شکار" کا آغاز دیکھیے:

"اگر آپ وقت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہیں ہیں اور آپ کی طبیعت میں مہم جوئی کے چھپے ہوئے جوہر بھی ہیں (جنہیں تلاش کرنا یقیناً کوئی مشکل کام نہیں) تو پھر کسی دریا کے کنارے پر یا کسی ڈیم کے پہلو میں مچھلی کا شکار کرنے سے بہتر کوئی شغل نہیں ہو سکتا۔"[60]

اب اسی انشائیے کا اختتامہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

مرزا صاحب جس دنیاوی زندگی کے تحت مچھلی کے شکاریوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں وہ اس روحانی سفر سے غالباً بے خبر ہیں جو یہ لوگ ڈور، کانٹا اور پانی کے توسط سے دنیائے موجود سے عالمِ

ناموجود کی طرف کرتے ہیں اور واپسی پر اپنے ہاتھوں میں امن وراحت کی مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں۔ان کے دل بہتے پانی کی طرح صاف، حسد سے پاک اور سنہری مچھلی کی طرح خوبصورت ہوتے ہیں۔ [61]

ایک انشائیے "نشہ" کا آغاز یوں کرتے ہیں: "کل صبح ایک ریٹائرڈ آفیسر کو سفید ٹی شرٹ اور نیکر میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی لیے خوبصورت السیشن نسل کے کتے کی معیت میں تیز تیز قدم اٹھاتے دیکھا۔" [62]

اسی انشائیے کا اچانک اختتام یوں کر دیتے ہیں: "مجھے کرسی اقتدار کا یہی رنگ پسند ہے جس میں عشق و سرمستی کے ساتھ پابندی آئین کے رشتوں کی قوسِ جھلملاتی ہے اور جس میں عیشِ دوام کا نشہ ہے۔" [63]

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ کہ انشائیہ مضمون سے بالکل الگ چیز ہے۔

4۔ عدم تکمیل

مانتین کے انشائیوں میں پائی جانے والے موضوعات میں قاری کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہی فکری پیاس اسے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔اس طرح وہ انشائیہ نگار کے انشائیہ ختم کرنے کے بعد بھی دیر تک غور وفکر میں ڈوبا رہتا ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں بھی عدم تکمیل کی خصوصیت بدرجہ اتم پائے جاتی ہے۔چند مثالیں دیکھیے :

جمیل آذر اپنے انشائیے "ریلوے پلیٹ فارم" میں موضوع پر نئے نئے اور انوکھے زاویوں سے نگاہ ڈالتے ہوئے قاری کا ذہن کہاں کہاں گھماتے ہیں اور پھر کئی باتیں نامکمل اور کئی سوال جواب طلب رہنے دیتے ہیں۔ مثلاً آدم وحوا اور ان کی اولاد کی زندگی کے سفر کے لیے دھرتی کا پلیٹ فارم اور پھر اس پلیٹ فارم پر ماندگی کے وقفے کی ہاو ہو۔رنگ وآہنگ اور آہ وواہ کے شور سے مملو دنیا کی عکاسی۔اب قاری کے ذہن میں کئی سوالات اٹھتے ہیں۔ مثلاً کیا اللہ تعالیٰ نے ہماری دنیوی زندگی کو ہمارے لیے اس ٹرین کے سفر کا ایک پلیٹ فارم بنایا ہے جس کا آغاز عالمِ ارواح سے ہوتا ہے اور اختتام جنت یا دوزخ پر ہوتا ہے؟

اسی طرح انشائیہ "شمولیت" میں ان کا خیال ہے کہ جو چیز ہمیں ناپسند ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ کہ ہم اس میں شامل نہیں ہوئے یا اس کے بارے میں ہمارا تجربہ نہیں ہے ورنہ وہ چیز ہمیں پسند ہوتی۔اس کے لیے

انہوں نے کرکٹ میچ کی مثال دیتے ہوئے اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کیا کہ کرکٹ میچ دیکھنا ان کے لیے اس وقت تک ناپسندیدہ رہا جب تک انہیں اس کے دیکھنے والوں کے ساتھ شامل ہونے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔اپنے اس خیال کی تائید میں انہوں نے اور بہت سی مثالیں بھی دی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو کر دعوتِ فکر دیتا ہے کہ کیا جمیل آذر کے اس قانون کا اطلاق ہر معاملے میں ہو سکتا ہے؟

اپنے انشائیے "نیم پلیٹ" میں ا ایک طرف ان کی رائے ہے کہ نیم پلیٹ شخصیت کا آئینہ ہے۔دوسری طرف وہ اپنے گھر کے مین گیٹ پر اپنی نیم پلیٹ لگانا نہیں چاہتے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ لوگ باگ ان کی شخصیت کو کیسے دیکھ پائیں گے؟

ایک اور انشائیے "نشہ" میں وہ چار قسم کے نشوں یعنی شراب، جنسِ لطیف، دولت وامارت اور اقتدار کا ذکر کرتے ہیں۔انشائیہ پڑھنے کے بعد قاری یہ سوچتا ہے کہ کیا ان چار قسموں کے نشوں کے علاوہ اور کوئی نشہ نہیں؟

مندرجہ بالا انشائیوں پر گفتگو نے واضح کر دیا کہ جمیل آذر کے انشائیوں میں عدم تکمیل کا احساس پایا جاتا ہے لہٰذا مانتین کے انشائیوں کی یہ خصوصیت جمیل آذر کے تمام انشائیوں میں موجود ہے۔

5۔ متنوع موضوعات

جمیل آذر نے بھی انشائیے کے مانتینی اصولوں کی تقلید کرتے ہوئے رنگارنگ اور مختلف اقسام کے موضوعات پر انشائیے لکھے۔ذیل میں ان کے انشائیوں کے موضوعات دیکھیے: "شاخِ زیتون"، "شمولیت"، "مچھلی کا شکار"، "واشنگ مشین"، "رت کے مہمان"، "وقت اے وقت"، "روشنی اے روشنی"، "تحفے"، "کھوکھلے لوگ"، "غالب، میں اور مردم گزیدہ"، "اشتہار زدہ لوگ"، "ناشر، مدیر اور ادیب"، شوقِ آوارگی " "اقبال، غالب اور رومی"، "تمباکو، بارود اور ایٹم"، "فیلٹ ہیٹ سے جناح کیپ تک"، "کرپشن کا دیو استبداد"، "جاوداں ہوں میں"، "، "کیا یہاں کوئی ہے؟"، "ہیومن کینن ہال"، "اردو، پنجابی اور انگریزی"، "اب اورتب ۔۔آئینہ تمثال دار"، "جنریشن گیپ"، "لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا"، "شیر اور سانپ"، "نشہ"، "حسن، سچائی اور قربانی"، "کچھ لکھنے کے بارے میں"، "ریلوے پلیٹ فارم"، "کچھ علالت کے بارے میں"

6۔ اختصار/کفایتِ لفظی

جمیل آذر کے انشائیوں کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔ان کے انشایئے موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے مختصر ہوتے ہیں۔وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرتے ہیں۔اور یہی خوبی مانتین کے انشائیوں کی شان ہے۔ملاحظہ کیجیے ان کے انشائیوں کے مجموعے "شاخِ زیتون"،""،"رت کے مہمان"،"وقت اے وقت"،اور"،"روشنی اے روشنی"۔

7۔ مسرت آفرینی/شگفتگی(تخلیقی تازگی)

جس طرح اوپر ذکر کیے گئے مانتین کے انشائیوں کے اقتباسات میں مسرت آفرینی اور شگفتگی(تخلیقی تازگی) کی خصوصیت واضح دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح جمیل آذر کے انشایئے بھی اس خصوصیت سے مملو ہیں۔یہ مثال دیکھیے:

> صبح کا تازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔میرے کان اس کی ہلکی سی جنبش کو بن دیکھے پہچان لیتے ہیں۔جس خندہ پیشانی سے یہ میرے کمرے میں نزولِ اجلال فرماتا ہے میں اسی بے اختیاری کے ساتھ بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور پھر چائے کے گرم شیریں گھونٹوں کے ساتھ اس کی فتنہ پردازیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔[64]

اقتباس مرقومہ بالا میں جمیل آذر نے نہایت شگفتہ اور بے تکلف انداز میں اخبار کے مطالعے کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اخبار کے بارے میں اپنی پسند اور دلچسپی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اظہار کا یہ انداز ہی شگفتگی کہلاتا ہے۔

8۔ گپ شپ کا انداز

جس طرح اوپر ذکر کیے گئے مانتین کے انشائیوں کے اقتباسات میں گپ شپ کا انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے۔اسی طرح جمیل آذر بھی اپنے انشائیوں میں گپ شپ میں گہری باتیں کر جاتے ہیں۔یہ مثال دیکھیے:

چند روز سے میرے پڑوس میں ایک صاحب نے اپنے نو تعمیر شدہ مکان کے باہر بڑی فن کاری سے ایک نیم پلیٹ آویزاں کر رکھی ہے۔ پلیٹ پر لکھے حروف کو حوادث سے محفوظ کرنے کے لیے اس پر ایک شیشہ چڑھا دیا گیا ہے، جیسے کوئی تصویر فریم میں لگادی گئی ہو اور ٹیکم پوڈر پر عمل کرتے ہوئے شیشے کے اندر ایک ودد چھوٹا سا بلب بھی نصب کر دیا گیا ہے۔ رات کو یہ بلب عجب عشوہ وانداز سے آنکھ مچولی کرتا ہے اور ہر راہرو سے کچھ اس طور سے نظرِ التفات کی درخواست کرتا ہے کہ آپ صاحبِ خانہ کے نام کو پڑھنے پر خود کو مجبور اور بے بس پاتے ہیں۔[65]

اقتباس بالا میں جمیل آذر شہرت کے دلدادہ اور نرگسیت کے شکار لوگوں کی ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس وہ صلاحیت یا تخلیقی ذہن نہیں ہوتا جو انہیں لوگوں کی نظروں میں نمایاں مقام دلوائے۔ پس ایسی لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر خود نمائی پر اتر آتے ہیں۔ دیکھیے جمیل آذر گپ شپ میں ایسے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں اور فلسفیانہ فکر عطا کرتے ہیں۔

9۔ اسلوب

مانتین کی طرح جمیل آذر کے اسلوب میں بھی مانوس اور ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال عام ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں "جمیل آذر کے انشائیوں کا سب سے بڑا وصف ان کا رواں دواں سٹائل اور تصویر کے دوسرے رخ دیکھنے کی کوشش ہے۔ ان کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے کوئی جھٹکا نہیں لگتا"[66] مشتاق قمر کی طرح وہ بھی اپنے انشائیوں میں الفاظ کی در و بست، زبان اور رموز و علائم وغیرہ کے استعمال میں مانتین کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ نمونے کے طور پر چند عبارات دیکھیے:

"زندگی کے تہہ در تہہ پھیلے ہوئے اوراق اور افق در افق سلسلہ روز و شب میں جب آپ ذوق وشوق کے ساتھ شمولیت اختیار کرتے ہیں تو مظاہر رنگ و بو اپنے سحر انگیز اسرار آپ پر منکشف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔"[67]

مرقومہ بالا اقتباس میں جمیل آذر قافیہ بندی، تکرارِ الفاظ، تشبیہ، استعارے، مرکباتِ عطفی کے خوبصورت استعمال اور مانوس و مترنم الفاظ کے استعمال نے اس جملے کے اسلوب کو شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

صبح کا تازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔"[68]

جملہ بالا میں ایک طرف صوتی رمزیت، ساختی متوازیت، تشبیہ، استعارے اور تکرار کے ساتھ ساتھ مانوس اور کانوں کو بھلے لگنے والے الفاظ اس جملے کے اسلوبیاتی حسن کو چار چاند لگاتے ہیں۔

"کتاب کی ضخامت دیکھ کر میری قوتِ ارادو متزلزل اور قویٰ مسلوب ہونے لگتے ہیں۔ میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی پر غالب آجاتی ہے اور میں عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے کتاب بصد احترام وادب الماری میں بطور امانت رکھ دیتا ہوں۔" [69]

اقتباسِ بالا میں ظاہری اسلوبیاتی محاسن، صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ واستعارے کے استعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اسلوبیاتی اوصاف یعنی سبک الفاظ کا چناؤ، اور متین الفاظ کا استعمال جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمیل آذر کا اسلوب مجموعی طور پر دلکش اور منفرد اسلوب ہے۔

10۔ دعوتِ فکر

مانتین کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت قاری کو غور و فکر پر مجبور کرنا ہے. وہ مضمون نگار کی طرح قاری کو خود سارا کام کر کے نہیں دیتا بلکہ کچھ کام خود کرتا ہے اور کچھ قاری کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں بھی قاری کو تحقیق و جستجو کی طرف راغب کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے انشائیے "نیم پلیٹ" کا یہ جملہ دیکھیے:

کسی نے یہ بات بالکل غلط کہی ہے کہ چہرہ شخصیت کا آئینہ ہے۔ میں کہتا ہوں نیم پلیٹ شخصیت کا آئینہ ہے۔ اگر فرائیڈ زندہ ہوتا تو وہ میری رائے سے ضرور متفق ہوتا کیونکہ تحت الشعور کی لہروں کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہے۔"[70]

مندرجہ بالا جملہ میں قاری کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کیا واقعی نیم پلیٹ سے کسی کی شخصیت کا بہتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے؟ یا چہرہ اس عمل میں زیادہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے؟

انشائیہ "شمولیت" کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"مجھے جمہوری نظام اس لیے پسند ہے کہ یہ ہمیں شرکت و شمولیت کی کھلے بندوں دعوت دیتا ہے جبکہ غیر جمہوری نظام ہم سے روحانی، جذباتی اور فکری شمولیت کا حق چھین لیتا ہے اور ہمیں لاتعلقی اور عدم دلچسپی کے صحرا میں عضوِ معطل کی طرح پھینک دیتا ہے۔"[71]

سطورِ بالا میں آمریت کی مذمت ہی نہیں کی گئی بلکہ اسے سخت نفرت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔یوں قاری کو آمریت اور جمہوریت کی خوبیوں و خامیوں پر غور کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

ایک اور انشائیہ "کھوکھلے لوگ" کا یہ اقتباس پڑھیے:

ان کی دنیا صرف اور صرف دولت ہوتی ہے۔ان کے دل باطنی نور اور روحانی سکون سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔یقین کیجیے میں نے بڑی بڑی پرآسائش عمارتوں میں جسمانی اور ذہنی بیماریوں کو بسیرا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔کہیں کینسر براجمان ہے، کہیں ہیپاٹائٹس لیٹا ہوا ہے، کہیں بائی پاس کا منتظر دل مضطرب بیٹھا ہے، کہیں ناکارہ گردے ڈائیالیسس یا ٹرانسپلانٹیشن کے لیے تڑپ رہے ہیں۔کہیں ویرانی اور خاموشی کا پہرا ہے کیونکہ یہاں کے مکین مزید دولت کے لیے نقل مکانی کر کے دیارِ غیر میں چلے گئے ہیں اور اپنے پیچھے ایک بوڑھا چوکیدار چھوڑ گئے ہیں۔[72]

اوپر نقل کی گئی تحریر میں جمیل آذر قاری کی توجہ حریصِ زر طبقے کی فطرت کی طرف مبذول کر رہے ہیں تاکہ وہ حرص و ہوس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بے سکون اور اضطراب بھری زندگی پر غور کر کے اس سے دور رہنے کی کوشش کرے۔

اپنے مشہور انشائیے "نیم پلیٹ" میں وہ لکھتے ہیں:

تعجب ہے "کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ اعیان نامشہود میں نیم پلیٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ویسے مجھے افلاطون کے نظریہ نقل پر مکمل اعتماد ہے۔فی الواقعہ ہم اصل کی نقل نہیں تو اور کیا ہیں اور یہ نیم پلیٹ لوحِ محفوظ کی ایک نقل ہی تو ہے۔پس جو تبدیلی نیم پلیٹ پر ظہور میں آتی ہے وہ پہلے لوحِ محفوظ میں پیدا ہوتی ہے۔"[73]

جملہ بالا میں جمیل آذر نے غیر محسوس طریقے اور لطیف انداز میں قاری کو افلاطون کے مشہور فلسفہ نقل ،لوحِ محفوظ اور نیم پلیٹ کے باہمی تعلق پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

زیرِ نظر باب میں لیے گئے موضوعاتی جائزے کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ انشائیہ نگاری میں مشتاق قمر اور جمیل آذر مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ سے متاثر بھی ہوئے اس کے انشائیوں کی پیروی بھی کی لیکن یہ بات بھی پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے مانتین سے دو قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے انشائیے کو دیسی اشیاء مثلاً پہاڑ، دریا، سمندر، میدان، دریا، دیہات، شہر، تہذیب و ثقافت، دستکاریاں اور ان سے وابستہ افکار و نظریات سے آشنائی عطا کرتے ہوئے مغربی انشائیے کو مشرقالیا۔

حوالہ جات

1. Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at. http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

2۔ایضاً

3. Montaigne, Of The Inequality Which Is Between Us,esays.translated by Charles Cotton {available at}http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

4. Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at. http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

5. Montaigne, Of The Inequality Which Is Between Us,esays.translated by Charles Cotton {available at}http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

6۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور1990ء،ص:67

7۔ مشتاق قمر،انشائیہ نگاری(مضمون)،مشمولہ انشائیہ کے فنی سروکار ،ایم آر پبلیکیشنز،نئی دہلی، اول، 2012ء،ص:199

8۔ ایضاً،ص:193

9۔ ایضاً،ص:200

10۔ ااایضاً،ص:193

11۔ ایضاً،ص،201

12۔ ایضاً،ص،202

13۔ ایضاً

14 ۔ ایضاً،

15۔ ایضاً،

16۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور1990ءص:67

17۔ انور سدید،ڈاکٹر،پہلا پتھر(دیباچہ)،ہم ہیں مشتاق، مصنف:پروفیسر مشتاق قمر، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون، 1970ء ،ص:36

18۔ جمیل آذر،انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلیکیشنز،راولپنڈی،2004ء،

19۔ عارف عبدالمتین،فلیپ ،ہم ہیں مشتاق، مصنف:پروفیسر مشتاق قمر، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون 1970ء

20۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ "جدید اردو انشائیہ" ،مرتب:اکبر حمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان،1991ء،ص:110

21۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون1970 ء،ص:51

22۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون1970 ء،ص:116

23۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون1970 ء،ص105:

24۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون1970 ء،ص:40

25۔ مشتاق قمر،میرا کتب خانہ (انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیر آغا، لاہور، مارچ/اپریل 1972ء،ص:241

26۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون1970 ء،ص:73

27۔ ایضاً،ص:79

28۔ ایضاً،ص:88

29۔ ایضاً،ص:95

30۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ "جدیداردوانشائیہ" ،مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1991ء،ص:107

31۔ ایضاً،ص:110

32۔ ایضاً

33۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:154

34۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:139

35۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء، ص26:

36۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء،ص:43

37۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:39

38۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:89۔90

39۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر1975ء، ص:26

40۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء،ص:43

41۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء،ص:59

42۔ ایضاً،ص:75

43۔ ایضاً،ص:142

44۔ ایضاً،ص:77

45۔ جمیل آذر،انشائیہ زندگی سے مربوط ہے(مضمون)، مشمولہ انشائیہ کے فنی سروکار،،ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی،اول،2012ء،ص:251

46۔ جمیل آذر،انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب، مشمولہ،ماہنامہ اوراق، مدیر:وزیرآغا،لاہور،شمارہ خاص-2، 1966ء،ص:123

47۔ جمیل آذر،انشائیہ زندگی سے مربوط ہے(مضمون)، مشمولہ انشائیہ کے فنی سروکار،ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی،اول،2012ء،ص:251

48۔ ایضاً،ص:251

49۔۔ ایضاً،ص:251

50۔ وزیرآغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور1990ءص:68

51۔ بشیر سیفی،ڈاکٹر،اردو میں انشائیہ نگاری،نذیر سنز پبلشرز،لاہور1989ء،ص264

52۔ رشیدامجد،ڈاکٹر،دیباچہ "رت کے مہمان""[38](انشائیہ اورانفرادی سوچ،ص82)

53۔ محمداسداللہ،انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں،ناشر خود،ناگپور،بھارت ،فروری، 2015ءص:244

54۔ جمیل آذر، شاخِ زیتون،لاہور،1981 ء، ص253

55۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

56۔ جمیل آذر،شمولیت(انشائیہ)،مشمولہ جدیداردوانشائیہ،مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 19 91ء،ص:112

57۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:30

58۔ جمیل آذر، شاخِ زیتون،1981 لاہور، ص253

59۔ جمیل آذر، مچھلی کا شکار،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، جنوری/فروری،1976ء،ص:39

60۔ ایضاً،ص:40

61۔ ایضاً،ص:40

62۔ جمیل آذر، نشہ(انشائیہ)،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، مئی/جون،1983ء،ص:42

63۔ ایضاً،ص:45

64۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

65۔ جمیل آذر، شاخِ زیتون،1981 لاہور، ص253

66۔ وزیرآغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور1990ء،ص:53

67۔ جمیل آذر،شمولیت(انشائیہ)،مشمولہ جدیداردوانشائیہ مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1991،ص:112

68۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

69۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

70۔ جمیل آذر،' نیم پلیٹ' ، شاخِ زیتون،1981 لاہور، ص253

71۔ جمیل آذر،شمولیت(انشائیہ)،مشمولہ جدیداردوانشائیہ،مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 19 91ء،ص:112

72۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:33

73۔ جمیل آذر،' نیم پلیٹ' ، شاخِ زیتون،1981 لاہور، ص253

باب چہارم

مونتین، مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ

ادب میں عام طور پر اسلوب سے مراد کسی ادیب یا مصنف کا مخصوص اندازِ بیاں یا خاص طرزِ تحریر مراد لیا جاتا ہے۔ اسلوب کے بارے میں ادب کی دنیا میں کسی ایسی تعریف پر اتفاق نہیں ہوسکا جو جامع اور مانع ہو۔ اسلوب میں ذات ،خیال، شخصیت ،الفاظ کا چناؤ، تحریر کا ڈھنگ ،انفرادی انداز، زبان، رویہ ،اظہار کا موزوں طریقہ وغیرہ شامل ہے۔اسلوب جو بھی ہو صاحبِ اسلوب کی ملکیت اور اس کی ذات کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے۔جس طرح کسی ایک زبان کے محاورے کے الفاظ کو لغوی ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کسی مصنف کے اسلوب کو بھی کسی دوسری زبان میں بعینہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

انشائیہ کے اسلوب میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ان میں سے پہلی خصوصیت روانی، دوسری ترنم اور تیسری کفایتِ لفظی ہے۔روانی سے مراد یہ ہے کہ تحریر میں الفاظ وتراکیب بوجھل اور نامانوس نہ ہوں اور نہ خیال میں کوئی علمی پیچیدگی یا فلسفیانہ موشگافی ہو۔ترنم سے مراد یہ ہے کہ تحریر میں سادگی، سلاست اور موزوں الفاظ کا چناؤ ہو جب کہ کفایتِ لفظی اختصار کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔یعنی عمدو اور کم الفاظ میں کسی بات کو اچھے ڈھنگ سے پیش کرنا ۔ لیکن محض تحریر کی خارجی صورتوں یعنی الفاظ کی دروبست۔قواعد کی پیروی، رموزو علائم وغیرہ کی پابندی کا نام ہی اسلوب نہیں بلکہ اسلوب دردحقیقت اس سے بلندتر شے کا نام ہے۔تحریر کی خارجی خصوصیات کا پایا جانا تو ہر تحریر میں ضروری ہے اور باقاعدہ مشق اور محنت سے ان خصوصیات کا پیدا کرلینا بھی کوئی مشکل امر نہیں۔اسلوب سے مراد دراصل و ہ تحریر ہوتی ہے جس میں اسلوب کے خارجی پہلوؤں کے علاوہ لکھنے والے کی شخصیت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور جو اس کی تحریر کو دوسروں کی تحریر سے مختلف بنادیتی ہے۔اس قسم کی تحریروں میں لکھنے والوں میں لکھنے

والے کی شخصیت،اس کامزاج،اس کافطری رنگ طبیعت، اس کاطرزِفکر،اس کی وہ تمام شعوتری اور لاشعوری کیفیات جس نے اسے لکھنے پر آمادہ کیا،نیزاس کاماحول اورعہدسب کارفرماہوتے ہیں اورانہی کے امتزاج سے اسلوب تشکیل پاتااور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

> ''جہاں تک اس(انشائیہ)کے اسلوب کاتعلق ہے سبھی لکھنے والوں نے اس امر کی توثیق کی ہے کہ انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔لطافت ایسی کہ انشائیہ مبتذل نہ ہوجائے اور شگفتگی ایسی کہ مزاح نہ ہونے کے باوجود تحریرفرحت بخش ہو۔''[1]

اسلوب کااطلاق عموماًفن کارکے اندازِ فکر،اندازِ بیان اوراس کے تخلیقی کارناموں پر ہوتا ہے۔مصنف جب اپنے مشاہدے اور مطالعے کویکسو اور منضبط کرتاہے اوراپنے بکھرے ہوئے تاثرات کوایک رشتے میں منسلک کرتے ہوئے انہیں لسانی شکل عطا کرتا ہے تواسلوب جنم لیتاہے۔مصنف کی شخصیت کو اس کے اسلوب کے حوالے سے ظاہرکیاجاسکتاہے۔ اسلوب کااس کے مصنف کی شخصیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ا نشائیہ نگار کا اسلوب بلندتر سطح کاہوتاہے۔انشاپردازی کا پر شکوہ اسلوب ہو یا خشک فلسفیانہ اسلوب انشائیہ کے لیے دونوں طرح کے اسالیب موزوں نہیں۔اسی طر ح انشائیے کے لیے نہ تو مقفیٰ، مسجع،عاری اورمرجز اسالیب جائزہیں اورنہ ہی رومانی اسلوب مناسب۔ اس کے علاوہ ادبِ لطیف والی زبان وانداز اور ٹیگوری اندازمیں بھی انشائیہ نہیں لکھاجاسکتا۔ انشائیہ کے اسلوب میں شگفتگی (تازہ کاری)مزاح اور قہقہہ بازی نہیں اور لطافت(ادبِ لطیف والی نہیں)کے اوصاف کاہونا ضروری ہے

ہر ادبی تخلیق زبان کے سانچے میں ڈھل کر سامع یاقاری تک رسائی حاصل کرتی ہے۔زبان کایہ سانچاادیب خود تیار کرتا ہے۔یہ ضرور ہے کہ سانچے کوتیار کرنے کے لیے خام مواد اس کے پاس پہلے سے موجود ہوتاہے۔یہ خام موادزبان کی وہ مروج شکل ہوتی ہے جسے

ادیب تہذیبی ورثے کے طور پر حاصل کرتاہے۔اور سماجی سطح پر اسے برتتا اور بروئے کار لاتا ہے ۔ زبان کی اس سپاٹ شکل کو وہ ترسیلی مقاصد کے لیے دوسروں کے ساتھ شیئر کرتاہے۔اس کی حیثیت محض ایک کوڈکی ہوتی ہے۔یہ جامد اورRigidہوتی ہے اور قواعد کے بندھے ٹکے اصولوں اورضابطوں کی پابند ہوتی ہے۔یہ غیر حرکی، غیر تخلیقی او ر افادی(Utilitarian)اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔زبان کے اس خام مواد کوجب ادیب اپنے تصورمیں لاتاہے ۔ اوراسے اپنے ادبی اظہار کاذریعہ بناتا ہے توگویاوہ اسے تخلیقی طور پر بروئے کار لاتاہے۔اسی لیے ہم اسلوب کی مدد سے صاحبِ اسلوب کی شخصیت کوپہچان لیتے ہیں ۔ اسلوب ابلاغِ خیال کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔چنانچہ بعض اسلوبیاتی ماہرین ادیب اوراس کی انفرادیت سے زیادہ خیال اورزبان کو اہمیت دیتے ہیں۔

ایک مکمل صنفِ ادب کی حیثیت سے انشائیہ متنوع اسلوب میں لکھاجاسکتاہے۔ہلکے ہلکے اندازمیں تو اکثر انشائیہ نگار لکھتے ہی ہیں اسے گھمبیرلہجے میں بھی لکھاجاسکتا ہے جس طرح اکبرحمیدی کاانشائیہ" میں سوچتا ہوں"جو ماہنامہ اوراق کے انشائیہ نمبرسالِ اشاعت۱۹۸۵ء میں شائع ہواتھا۔اکبرحمیدی نے اسلوب پراس طرح کے بہت سے تجربے کیے ہیں جو ماہ نامہ " اوراق "کی مختلف اشاعتوں کی زینت بنے ہیں۔انہوں نے" نظامِ سقہ "جیسا تاریخی انشائیہ،" ٹھینگا باجے " جیسا سیاسی انشائیہ ، نظریاتی نقطۂ نظر کے حامل انشائیے " بگڑاہوابچہ "اور"سپنوں کاگاؤں "اور نفسیاتی کیفیات پرمشتمل انشائیہ" شوقِ فضول "وغیرہ لکھ کر انشائیے کو یکسانیت سے بچایا،انشائیے کی Readabilityکوبڑھایااوراس کے حسن میں اضافہ کیا۔

ادب کازبان کے ساتھ بہت ہی گہرارشتہ ہے ۔زبان کے لیےادب ضروری ہویانہ ہو ادب کے لیے زبان کی ضرورت مسلم ہے۔ کیونکہ ادب کی ترسیل زبان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔عام ادمی کی زبان سیدھی سادی،سپاٹ اورترسیلی ہوتی ہے ۔یہ لسانی قواعد ، ضوابط اوراصولوں کی پابندہوتی ہے جب کہ ادیب کی زبان لفظی ومعنوی صنائع و بدائع)تشبیہ، استعارہ،تمثیل،

علامت، پیکر تراشی، امیجری ، وغیرہ(سے کام لیتی ہے۔اسلوب کالفظ جب بھی استعمال کیاجاتاہےاسی ادبی زبان کے لیےہی کیاجاتا ہے۔

اسلوب کے لغوی معانی ہیں طریقہ، طرز، روش، انداز۔ادب کی اصطلاح میں اس سے مراد کسی مصنف یا ادیب کامخصوص اندازِ بیاں یا خاص طرزِ تحریر ہے۔اسلوب میں شخصیت، ذات، خیال، الفاظ کاچناؤ، تحریر کاڈھنگ، انفرادی انداز، زبان، رویہ اوراظہار کا موزوں طریقہ وغیرہ شامل ہیں۔اسلوب کسی مصنف کاانفرادی بھی ہوسکتاہے اور کسی طبقے یاعہد کااجتماعی بھی۔یہ کسی صنفِ ادب کا بھی ہوسکتاہے اورکسی دبستان کابھی۔اسلوب اظہارِخیال کاموثرہتھیار اورابلاغِ خیال کااہم ذریعہ ہے۔شعرہویاکوئی نثرپارہ جملوں سے مل کربنتاہے اورجملے الفاظ کامجموعہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ اظہارِ مدعا کی علامتیں ہوتی ہیں ۔مختلف الفاظ کے مختلف اثرات ہوتے ہیں۔چونکہ یہ زہر کی طرح تلخ بھی ہوسکتے ہیں اورشکر کی طرح شیریں بھی ،بدصورت اورکرخت بھی ہوسکتے ہیں اور خوبصورت اورنرم بھی، ثقیل اور دقیق بھی ہوسکتے ہیں اورسبک اور لطیف بھی،اس لیے اس بات کے کہنے میں دورائے نہیں ہوسکتیں کہ اسلوب اسی طرح کاہوگا جس طرح کے مخاطبین و قارئین ہوں گے اورجس طرح کا موضوع ومضمون ہوگا۔کوئی ایک مصنف ایک سے زائد اسلوب کامالک ہوسکتا ہے جیساکہ ابوالکلام ازادکے مخاطبین جب عوام سے زیادہ علما و تعلیم یافتہ طبقہ تھا توانہوں نے "الہلال "کااسلوب ایجادکیا اور جب روئے سخن علما وتعلیم یافتہ طبقہ سے زیادہ عوام کی طرف پھیرناپڑا تواسلوب بدل دیا چنانچہ "غبارِ خاطر "اور"الہلال "کافرق اس بات کی زندہ دلیل ہے۔اسی طرح ،مرزاغالب کی تصانیف "انشائے غالب" اور "اردوئے معلیٰ "کے اسالیب میں فرق ،سرسید کی کتاب" اثار الصنادید "اور"مضامینِ تہذیب الاخلاق "کے اسالیب میں فرق ،محمدحسین ازاد کی تصانیف" دربارِاکبری" اور"نیرنگ خیال "کاباہمی اسلوبیاتی اختلاف اس موقف کی پرزور تائیدکرتاہے کہ کسی ایک مصنف کااسلوب ایک سے زیادہ ہوسکتاہے کیونکہ یہ غیرمرئی خیالات کا مرئی وجودہے جسے مصنف الفاظ کاوہ لباس پہناتاہے جواس پرجچتاہےاوریہی لباس لسانیات

کہلاتاہے۔پس اسلوب کا حقیقی تجزیہ لسانیاتLinguistics کے حوالے سے ہی ہوتا ہے ۔باقی رہی شخصیت تو دمِ تحریر اس کا عکس خودبخود ہی نمایاں ہوجاتاہے۔

چونکہ ادب کاذریعہ اظہارزبان ہے جبکہ اسلوب کا تعلق ادب میں زبان کے استعمال سے ہے، اس لیے اظہار کے جدید تر اندازاور صوتی،صرفی ،نحوی،لغوی، معنوی ، لفظی سطحوں پرنت نئے لسانی سانچوں کی تصنیع سے ہی اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔پس زبان کو تخلیقی اورادبی بنانے کے لیے یہی باتیں پیشِ نظر رکھناپڑتی ہیں ۔اسلوب کی جدید تعریف کے مطابق کسی تحریر کے اسلوبیاتی تجزیےسے مرادادب پارے کا لسانیاتی مطالعہ ہے۔لہٰذا کسی فن پارے کے اسلوبیاتی تجزیے کے دوران ماہرِ اسلوبیات کی تمام تر توجہ اس فن پارے کی زبان پرمرکوزہوتی ہے۔زبان کے مطالعے اور تجزیے سےوہ ان اسلوبیاتی خصوصیات کاپتالگالیتاہےجوکسی مصنف یاکسی فن پارے کی انفرادیت کی دلیل ہوتی ہےیعنی جن سے ایک مصنف کے اسلوب کودوسرے مصنف کے اسلوب سے یاایک فن پارے کودوسرے فن پارے سے ممیزکیا جا سکتاہے۔

> اسلوبیات کے ماہر مرزاخلیل احمدبیگ لکھتے ہیں"اسلوبیاتی تنقیددراصل لسانیاتی مطالعہ ادب ہے۔یہ ادب اور لسانیات کے مابین پل کاکام کرتی ہے۔۔۔اس میں مصنف کے بجائے متن کواہمیت دی جاتی ہے۔اسی کے مطالعےاور تجزیے سے نتائج مرتب کیے جاتے ہیں۔" [2]

مشیل دی مانتین کے انشائیوں کااسلوبیاتی جائزہ:

مانتین نے اظہار کے جدید تر اندازاور صوتی،صرفی ،نحوی،لغوی، معنوی ، لفظی سطحوں پرنت نئے لسانی سانچوں کی تصنیع سے اپنے اسلوب کو تشکیل دیا ہے۔اسلوب کی جدید تعریف،جس کاذکر سطورِ بالامیں کیاگیاہے کے مطابق مانتین کےانشائیوں کا اسلوبیاتی تجزیہ یعنی لسانیاتی مطالعہ پیشِ خدمت ہے:

مشیل دی مانتین کے ایک انشائیے کا یہ اقتباس دیکھیے:

Compare with such a one the common rabble of mankind, stupid and mean-spirited, servile, instable, and continually floating with the tempest of various passions, that tosses and tumbles them to and fro, and all depending upon others, and you will find a greater distance than betwixt heaven and earth; and yet the blindness of common usage is such that we make little or no account of it; whereas if we consider a peasant and a king, a nobleman and a vassal, a magistrate and a private man, a rich man and a poor, there appears a vast disparity, though they differ no more, as a man may say, than in their breeches. neither the courage to die nor the heart to live, who will neither resist nor fly, what can we do with him? (Translated by Charles cotton.)[3]

انسانوں کے ایک ایسے مشترک ہجوم کا موازنہ کریں جس میں بے وقوف، کم ظرف، غلامانہ ذہنیت کے حامل اور مختلف قسم کے جذبات کے حامل لوگ شامل ہیں جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے، اور جن کا تمام تر دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔ اور تم اس ہجوم کے لوگوں میں باہم (معاشی، طبقاتی اور معاشرتی سطح کا فاصلہ) زمین اور آسمان کے فاصلے سے زیادہ پاؤ گے۔ لیکن ہم عام استعمال ہوتے ہوئے اس اندھے پن کا تھوڑا یا زیادہ کچھ بھی حساب نہیں دیتے۔ حالانکہ ہم غور کرتے ہیں تو ایک کسان اور بادشاہ، ایک آقا اور غلام، ایک مجسٹریٹ اور ایک عام آدمی ایک امیر اور ایک غریب کے درمیان وسیع عدم

مساوات دکھائی دیتی ہے ۔ان کی نیکریں دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں جیساکہ کوئی کہہ سکتاہے۔نہ ان میں مرنے کی جرات ہے نہ جینے کا جذبہ،جو نہ مزاحمت کریں گے نہ فرار ہوں گے ہم ان کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟(ترجمہ راقم)

آیئے اقتباسِ مرقومہ بالا کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہیں:

شماریت:

یعنی مختلف اشیاء یا افعال کا ایک ایک کر کے نام لینا مثلاً" جس میں بے وقوف، کم ظرف، غلامانہ ذہنیت کے حامل اور مختلف قسم کے جذبات کے حامل لوگ شامل ہیں۔"

خاصیتِ تضاد: (Antithesis)

"ایک کسان اور بادشاہ، ایک آقا اور غلام، ایک مجسٹریٹ اور ایک عام آدمی ایک امیر اور ایک غریب۔"

ساختی متوازیت: (Constructional Parallelism)

" جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے، اور جن کا تمام تر دارومدار ایک دوسرے پر ہے"۔

تشبیہ واستعارات کا استعمال:(Usage of simile and metaphor)

" جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے۔

تکرار(repetition) :

مندرجہ بالا جملہ میں دو الفاظ "tosses and tumbles" میں "t" کی تکرار قاری کی سماعت پر ایک خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ مرقومہ بالا اسلوبیاتی اوصاف کا مانتین کے اسلوب کو دلکش اور شگفتہ بنانے ہیں خاص حصہ ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں انہی اسلوبیاتی اصولوں کے تحت مشتاق قمر اور جمیل اذر کے انشائیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ:

مشتاق قمر اردو کے معروف انشائیہ نگاروں، افسانہ نگاروں، ڈرامہ نگاروں، ناقدین، مضمون نگاروں اور ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کے انشائیوں کا ایک ہی مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" جون 1970ء میں مکتبہ اردو زبان ، سرگودھا سے ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں ان کے 14 انشائیے شامل ہیں جب کہ ان کے پانچ مزید مطبوعہ انشائیے بھی دریافت ہوئے ہیں ۔

اگرچہ مشتاق قمر کے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور مضامین میں بھی زبان کے اسلوبیاتی استعمال کے بڑے اچھے اور اچھوتے نمونے موجود ہیں مگر ہم زیرِ نظر مقالے کی ضرورت کے پیشِ نظر یہاں صرف ان کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیں گے۔

(1)صوتی تجزیہ(Phonetic analysis)

صوتی رمزیت(Sound Symbolism)

صوتی سطح پر مشتاق قمر کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیات صوتی رمزیت ہے جس میں الفاظ کی صوتی ساخت اور دروبست سے ان کے معانی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً" اس میں توہلکے ہلکے سروں کا سرور اور خواب آور کیف ہے۔"[4]

(مندرجہ بالا جملے میں" س "کی سرگم اور"ہلکے ہلکے "اور "خواب آور کیف "جیسے الفاظ نے ماحول کو خواب ناک ، مست اور مسحور کن بنادیا ہے۔)

> لیکن آئس کریم کی" پلیٹ"سامنے آتے ہی ساری گرما گرمی جاتی رہتی ہے۔گفتگو کا ملکہ جوانسانی سرشت میں خاص طور پر ودیعت کیا گیا ہے،یکسر مفقود ہو جاتا ہے۔آپ کی زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے اور آپ کو بحالتِ مجبوری کوئی ایک آدھ جملہ ادا کرنا ہی پڑے تو آپ کی زبان خلا میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کرنے والے انسان کی

طرح لڑکھڑانے لگتی ہے۔ زندگی کے سیدھے سادے اور سلجھے ہوئے مسائل بھی ناقابلِ حل نظرآنے لگتے ہیں اورآپ کویوں محسوس ہونے لگتاہے گویا صفحہ ہستی پر ایک بڑی سی سل جماکراس پراخری کیل ٹھونک دی گئی ہو۔[5]

(یہاں صفیری حروف"(fricative words) س" اور"ص "کی اوازوں سے سردی اورٹھنڈک کےاحساس کی عکاسی لفظوں میں کی گئی ہے۔)

اگرآپ کے ساتھ یہ حادثہ کسی ایسے مقام پر پیش آیاہوجہاں اشیائے خوردونوش کے عوض سخت اورکھردرے چاندی سونے کے سکے کے ٹکڑے وصول کرنے کارواج بھی ہوتو آپ کی حالت اورزیادہ دگرگوں ہوجائے گی اورآپ ازالہ حیثیتِ عرفی میں ہارے ہوئے مدعی کی طرح جیب کابوجھ ہلکاکرکے،سرجھکائے،بغل میں چھڑی دبائے بڑی خاموشی سے باہرنکل آئیں گے۔[6]

(یہاں" س"،"ث"،"ص"،"ث"،"ک"،"ر"،"ڑ "کی اوازوں کی تکرار میں مختلف احساسات کی عکاسی مخصوص صوتی رمزیت پیداکرتی ہے)

"یا یونہی چورچور پکارتے ہوئے سڑک پر بھگٹٹ بھاگتے چلے جانا۔"[7]

(یہاں" بھگ "کالفظ تیزدوڑنے کا احساس دلاتا ہے۔)

"اگرانسان کوزہر کھانے کا بھی سوداسمایا تواس کے اعلیٰ انسانی اصولوں کی آڑ لے کرزہرکاپیالہ پی لیا۔"[8]

(یہاں" س "اور"ل"کی تکرار ایک طرف عبارت میں لطف پیداکرتی ہے تودوسری طرف اسلوب میں روانی اوردلکشی پیداکرتی ہے۔)"دنیاکی ہرچھوٹی بڑی چوٹی بلاتخصیصِ ملک وملت باربارسرکرنے کی کوششیں پیہم جاری وساری ہیں۔"[9]

(یہاں" ٹ" ،"م"۔"ر"وغیرہ کی تکرارکے ساتھ اٹھنے والی اوازیں اسلوب میں صوتی اہنگ اورتازگی پیداکرتی ہیں۔)

تجنیسِ صوتی(Alliteration)

کسی جملے یافقرے کے دو یادوسے زیادہ قریب الوقوع الفاظ کا ایک ہی آواز سے شروع ہونا تجنیسِ صوتی کہلاتاہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں تجنیسِ صوتی کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔مثلاً "محض چینی کی مخالفت میں چائے کے ساتھ شغف برتاجاتاہے۔"[10]

"سب سے پہلے وہ صنفِ مخالف میں کبھی اپنے ایسے" حقیقت شناس "کی تلاش کرتاہے۔"[11]

"ابھی اس کے پاؤں زمین کی سوندھی سوندھی خوشبووالی مٹی سے مس نہیں کرپائے تھے۔"[12]

"انسان اورزمین کے درمیان کھجور کی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔"[13]

"اس نے آگ سلگانے اورالاؤ کے گردبیٹھنے کے آداب بھی سیکھ لیے ہیں۔"[14]

"چنانچہ تہذیب کے اس پہلے دور میں آپ کوکچھ عورتیں اورمرد الاؤکے اردگرد آلتی پالتی مارے بیٹھے دکھائی دیں گے۔"[15]

"جہاں کی ہر شے اپنی قدرتی حالت میں قینچی،استرے کی مصنوعی تراش خراش سے بے نیاز ساری راہ تک رہی ہے۔"[16]

مندرجہ بالا جملوں میں پہلے جملے میں "چینی" اور"چائے "،دوسرے جملے میں "سب ،سے ،صنف ،ایسے"اور"شناس ،تلاش " ،تیسرے جملے میں" اس، سوندھی سوندھی، سے، مس"،چوتھے جملے میں""انسان، زمین، درمیان" اور" کھجور، رکاوٹ، رہی"،پانچویں جملے میں "آگ، سلگانے، گرد"،چھٹے جملے میں "الاؤ، اردگرد، آلتی پالتی"اورآخری جملے میں" قدرتی، قینچی "،"استرے مصنوعی"،" شے، تراش، خراش"،" سے، ساری، راہ، رہی" تجنیسِ صوتی کی مثالیں ہیں۔

قافیہ بندی (Rhyming)

جملوں اور فقروں میں قافیوں کاالتزام بھی اسلوب کی دلکشی کاسبب بنتاہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی متعددمقامات پر قافیوں کا التزام ہے۔البتہ یہ التزام مشتاق قمر کے ہاں غیرشعوری طورپرہواہے۔چندمثالیں دیکھیے:

"اورآپ کی چاند)منڈاہواسر (کسی ارتقائی عمل کے تحت) ایک ایسے چکنے کدومیں تبدیل ہوجائے گی جس پربال توایک طرف خود خیال کے قدم پھسلنے لگیں گے۔"[17]

حتیٰ کہ حیات کاہرابھرا درخت ٹنڈ منڈ ہوجاتاھے۔"[18]

"یعنی ان میں" سوچ بچار "اور"معاشرہ سدھار "کاعنصر کچھ زیادہ نہیں تھا۔"[19]

اگرآپ کے ساتھ یہ حادثہ کسی ایسے مقام پر پیش آیاہوجہاں اشیائے خوردونوش کے عوض سخت اورکھردرے سونے کے سکے کے ٹکڑے وصول کرنے کارواج بھی ہوتو آپ کی حالت اورزیادہ دگرگوں ہوجائے گی اورآپ ازالہ حیثیتِ عرفی میں ہارے ہوئے مدعی کی طرح جیب کابوجھ ہلکاکرکے،سرجھکائے،بغل میں چھڑی دبائے بڑی خاموشی سے باہر نکل آئیں گے۔"[20]

"ایک علت تووہی شکم سیری کاکائناتی قضیہ ہے جس میں ہم تم اورمیر سبھی یکساں اسیر ہیں"[21]

"دنیاکی ہرچھوٹی بڑی چوٹی بلاتخصیص ملک وملت باربارسرکرنے کی کوششیں پیہم جاری وساری ہیں۔"[22]

"بلکہ اس سوراخ کے ذریعے دوسروں تک منتقل ہونے والی رقم کااحساس بھی بڑاشدیدہوتاہے۔"[23]

"آئس کریم کاشمارنہ توماکولات میں کیاجاسکتاہے نہ مشروبات میں۔"[24]

"آپ اس کا قلع قمع کروانے اوراسے گھر کاراستہ دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔"[25]

مندرجہ بالاجملوں میں "ہرا، بھرا" ،" ٹنڈ، منڈ"،" بال ، خیال "،"سوچ بچار،معاشرہ سدھار"،" چاندی سونے کے ، سکے کے ٹکڑے"،"سرجھکائے، چھڑی دبائے"،"ہم تم اورمیر، سبھی یکساں اسیر"،" چھوٹی ،چوٹی"،" جاری ،ساری" ، سوراخ ،احساس"،"ماکولات ،مشروبات"،" قلع قمع کروانے ، گھر کاراستہ دکھانے" قافیہ بندی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

صرفی ونحوی تجزیہ

ساختی متوازیت (Constructional Parallelism)

جب دویادوسے زیادہ جملے یاجملے کے قریب الوقوع اجزا نحوی ساخت کے اعتبارسے متوازی (parallel)ہوں یعنی ان میں نحوی مماثلت یامطابقت پائی جاتی ہو تواسے ساختی متوازیت کہاجاتاہے۔ساختی متوازیت میں بالعموم الفاظ اورحروف (حروف عطف وربط وغیرہ) کی تکرارپائی جاتی ہے۔لیکن خالص متوازیت کا انحصاران چیزوں پرنہیں ہوتا،بلکہ جملوں یافقروں کے باہمی سانچوں اورشکلوں کی تکرار پر ہوتاہے۔ساختی متوازیت جزوی (partial)بھی ہوسکتی ہے اورکلی (total)بھی۔جزوی ساختی متوازیت میں ایک جملہ دوسری متواتر جملے یاجملوں سے مکمل طورپر نحوی مطابقت رکھتا ہے۔ کلی ساختی متوازیت کوتوازن بھی کہتے ہیں۔ساختی متوازیت جذبات میں ہلچل مچادینے والاطرزِبیان ہے۔جذبات کوابھارنے والایہ کام متوازی ساختوں سے اس طرح لیاجاتاہے کہ کہیں یہ چیزیں گنتی یاترتیب کاکام کرتی ہیں اور کہیں یہ مترادفات کاکام سرانجام دیتے ہیں اور کہیں ان سے بیان میں وضاحت پیداکی جاتی ہے۔ان سب سے قطع نظر متوازی ساختےعبارت میں ایک ایساآہنگ یاپیٹرن پیداکردیتے ہیں جونثر کوشعر کی طرح مترنم بنادیتاہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں سے ساختی متوازیت کی مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیے:

"اورآپ کولمحہ بھر کے لیے بھی اس کااحساس نہیں ہوپاتا کہ ان اونچی اونچی دیواروں کی تہہ میں موت کالاوہ ابل رہاہے۔سجے سجائے چہروں پر نیستی کی پرچھائیں مسلط ہیں۔"[26]

"ریلوے قلی سے لےکر لانبی کاروالے سیٹھ تک کوآپ نے بے دھیانی میں مسکراتے،آنکھیں سکیڑتے اورفضا میں گھورتے دیکھا۔"[26]

"بے شک آپ گھٹنے ٹیکیں۔گزگزبھرلمبی زبان نکالیں۔آپ کی ہڈی پسلی چکناچورہوجائے۔جسم کاہرعضو چیخ چیخ کرآپ کی شکست کااعتراف کرے۔لیکن جب تک آپ" بیٹھنے"سے دستبردارہوکر چت نہیں لیٹ جاتے اس بلائے عظمیٰ سے رستگاری پانے کے تمام حربے بیکارثابت ہوتے ہیں۔"[27]

"انسان کاکام محض دریاوں ندیوں کارخ موڑنانہیں بلکہ ان کے کنارے نرم نرم ریت پر سررکھے،دھوپ کی ننھی ننھی شعاوں کی شال اوڑھےکچھ دیر کے لیے فطرت کے مناظرسے لطف اندوزہونابھی ہے۔"[28]

"اس وقت آپ کومحسوس ہوگاگویاستارے ایک عالمِ سوگوارمیں ہاتھ مل رہے ہیں۔چاندکسی کے انتظارمیں محوِحیرت واستعجاب ہے۔اس کی ضیاپاش نگاہیں تھک چکی ہیں ۔درخت،پتے،ٹہنیاں،لہلہاتے کھیت۔سڑکیں، پگڈنڈیاں۔جھرنے چشمے۔ندی، نالے،دریا۔فطرت کاہرعنصر یاسیت اورشکست خوردگی کے احساس تلے کراہ رہاہے۔"[29]

"اس میں پھول بھی کھلتے ہیں۔کلیاں بھی چٹکتی ہیں۔درخت سبزسبزجامے بھی اوڑھتے ہیں اورفطرت کابے رحم ہاتھ ان سے یہ شگوفے اورکلیاں چھین بھی لیتاہے۔"[30]سچ پوچھیے تویہ قدرت کاایک بہت بڑافیاضانہ عطیہ ہے جو کرہ ارض پرانسانی زندگی کوسہل،ممکن اورقصہ آدم کورنگیں بنانے کااہم فریضہ سرانجام دیتاہے۔"[31]

مندرجہ بالا جملوں کے خط کشیدہ ٹکڑے آپس میں ساختی متوازیت کی خصوصیات کے حامل ہیں۔

عکسِ متوازیت(chiasmus)

یہ ساختی متوازیت کا عکس یااس کی تقلیب ہے۔عکسِ متوازیت بھی تحریر میں ایک خاص حسن پیداکرتاہے۔جب دومتواتر جملے یاان کے اجزا ایک دوسرے کامعکوس ہوں تو اسے عکسِ متوازیت کہاجاتاہے۔اس میں نہ صرف الفاظ وتراکیب کی ترتیب الٹ جاتی ہے بلکہ اکثر نحوی سانچوں میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ مشتاق قمر کے ہاں عکسِ متوازیت کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ چندمثالیں دیکھیے:

"رہبراپنے پیروکاروں اورپیروکار اپنے رہبرکے ذریعے "ہچومادیگرے نیست "کی ازلی وابدی خوش فہمی کی تصدیق وتائید کرتے ہیں"[32]

لیکن اسے کیاکہیے کہ ہم بہت سے غیرسنجیدہ کاموں کو انتہائی سنجیدگی اورسنجیدہ کاموں کو بڑی غیرسنجیدگی کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔"[33]

اگر ذہنی پختگی کے حصول سے قبل آپ چائے چینی کی خاطرپیتے تھے تواب محض چائے کی خاطرچینی کی ایک آدھ چمچ گواراکرلیتے ہیں۔"[34]

مندرجہ بالاجملوں میں"رہبراپنے پیروکاروں ،پیروکار اپنے رہبر "،" غیرسنجیدہ کاموں کو انتہائی سنجیدگی ،سنجیدہ کاموں کو بڑی غیرسنجیدگی کے ساتھ"،" چائے چینی کی خاطر ،چائے کی خاطرچینی " عکسِ متوازیت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تضاد(Antithesis) :

اسلوبیاتی تنقیدوتجزیے میں تضاد منطقی بھی ہوتاہے اوراسلوبیاتی بھی۔یہ تضادکسی بھی طرح کے دولفظوں میں جوایک دوسرے کی ضدہوں دیکھاجاسکتاہے۔متضادمتوازی ساختوں کی وجہ سے عبارت میں ایک مخصوص قسم کاآہنگ یاپیٹرن پیداہوجاتاہے جس کی وجہ سے اسلوب کی دلکشی بڑھ جاتی ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں سےاس کی چندمثالیں دیکھیے:

"ایک طبقہ اپنی تصانیف کی ضخامت کوکم سے کم اوردوسرازیادہ سے زیادہ کرنے کی طرف مائل ہے۔"[35]

"گویانقب زن نے آپ کی پھلواری سے "نیک نامی "کے سارے" پھول" چن لیے ہیں اوراب" بدنامی "کے خالی خولی ڈنٹھل باقی رہ گئے ہیں۔"[36]

"لوگ خوشی سے بے قابوہوکرفلک شگاف قہقہہ لگائیں یاغم سے نڈھال ہوکرزاروقطارروئے لگیں۔"[37]

"لیکن اسے کیاکہیے کہ ہم بہت سے غیرسنجیدہ کاموں کو انتہائی سنجیدگی اورسنجیدہ کاموں کو بڑی غیرسنجیدگی کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔"[38]

"ذہنی پختگی کاآغاز کڑوے تمباکوکے استعمال سے ہوتاہے اورانجام صوفیوں اورجوگیوں کی طرح ہرمیٹھی چیز کوخیرباد کہنے سے۔"[39]

"کوہ پیمائی دراصل ایک داخلی ابال کا خارجی اظہار ہے۔"[40]

"اگرچہ شہرت حاصل کرنے کایہ طریقہ کم خرچ بالانشیں ضرورہے۔۔۔"[41]

"اس کے بعد پرانی تہذیب کی اس آخری نشانی کی بازیابی کی ایک زبردست جدوجہدکااغازہوجاتاہے جس کی ابتدااشتہاری تیل اورانتہاتعویذ گنڈوں پرہوتی ہے۔"[42]

مندرجہ بالاجملوں میں "کم ،زیادہ،" "نیک نامی ،بدنامی"،" قہقہہ لگائیں ، زاروقطارروئے لگیں"،"غیرسنجیدہ، سنجیدگی" ،"سنجیدہ، غیرسنجیدگی "،"آغاز،انجام "،"کڑوے، میٹھی چیز"،"استعمال، خیرباد"،" داخل ،خارج"، " داخلی ابال ، خارجی اظہار"،"ابتداءانتہا"اشتہاری تیل، تعویذ گنڈوں " تضادکی عمدہ مثالیں ہیں

تجسیم سازی(personification)

تجسیم سازی (personification) بھی کسی ادبی تحریر کودلچسپ اورجاذبِ نظربنادیتی ہے۔قاری اس فن سے اپنے اسلوب کوچارچاندلگادیتاہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی تجسیم سازی

(personification)کا ہنر پایا جاتا ہے۔ کو دیکھا جاسکتا ہے۔مشتاق قمر کے ایک انشائیے سے لیے گئے مندرجہ ذیل اقتباس میں بڑھاپے کا دبے پاؤں آنا اور کندھے پر ہاتھ رکھنا تجسیم سازی کی عمدہ مثال ہے۔ملاحظہ کیجیے:

> یہ بڑھاپا(جسے میں اصلی اور اور فطری بڑھاپا کہوں گا)ماہ وسال کے پربت سے پھسلتا ہوا دور نیچے ڈھلوان میں،دبے پاؤں ،آپ کو آلیتا ہے اور ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہے"امید ہے آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔"اس غیر مانوس سی آواز پر آپ جھنجھلا کر نہایت بے رخی سے جواب دیتے ہیں۔"دور ہو جا۔اپنے سرد ،مرجھائے ہوئے ہاتھ پرے ہٹا لے۔ میں تمہیں نہیں جانتا تم کون ہو؟۔بہروپیا کہیں کا—"بڑھاپا زیرِ لب مسکراتے ہوئے آپ کو یوں تکنے لگتا ہے گویا کہہ رہا ہو۔ "اصل روپ تو یہی ہے اس سے پہلے تو سبھی بہروپ تھے۔—"آپ اس کے ہاتھ پرے جھٹک دیتے ہیں اور پھر مکہ تان کر"ابھی تو میں جوان ہوں " کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔لیکن بڑھاپے کی تاب نہ لاکر لڑکھڑاتے قدموں بھاگ اٹھتے ہیں حتیٰ کہ آپ کا سانس پھول جاتا ہے۔[43]

مندرجہ بالا پیرا گراف میں مشتاق قمر نے بڑھاپے کو ایک متحرک،فعال اور جان دار انسان کے روپ میں پیش کرتے ہوئے اس سے مکالمے ادا کروائے ہیں،یہی تجسیم سازی(personification) ہے۔

مرکباتِ عطفی کا استعمال (Usage of Conjunctional Compound)

اردو زبان میں مرکباتِ عطفی کا استعمال عام سی بات ہے مگر اسلوب کی ایک خصوصیات کی حیثیت سے ان کا مطالعہ اسلوب فہمی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔اسلوبیاتی تجزیے میں ان مرکبات کو صوتیاتی،صرفی ونحوی اور معنیاتی سطح پر پرکھنا ایک دلچسپ اور اہم سرگرمی ہے۔انشائیہ کے بانی مشیل دی مونتین کے عطفی اور ترادفی مرکبات کا ایک بڑا اچھا تجزیہ رچرڈ سیس نے اپنے ایک مقالے" Literary Style-A Symposium" میں پیش کیا ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں استعمال شدہ مرکباتِ عطفی کے اس تجزیے سے ان کے زبان و اسلوب کی بے شمار خصوصیات

نمایاں ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے لیے انہیں تین بڑے زمروں(صوتیاتی ، صرفی ونحوی اور معنیاتی) میں تقسیم کیاجاتاہے۔

صوتیات کا فن کارانہ استعمال (Artistic Usage of Phonetics)

صوتی سطح پر ہمیں مشتاق قمر کے یہاں عطفی مرکبات کی شکل میں تجنیسِ صوتی،مصوتی تکرار، مصمتی تکرار،وزن واہنگ ، قافیہ بندی اور خوش آوازی کی مثالیں اکثر مقامات پر نظر اتی ہیں۔صوتیاتی اعتبار سے مرکباتِ عطفی کا تجزیہ اوران کی درجہ بندی ذیل کے مطابق کی جاسکتی ہے:

مرکب عطفی کے دونوں اجزاکاایک ہی آواز سے شروع ہونا۔:

"جسے وہ تگ وتازِ حیات میں مختلف کروٹیں دیتارہتاہے۔"[44]

"جس کے نزدیک بلندی کے حصول کے لیے روح اور جسم کامکمل اتحاد وارتباط بے حد ضروری سمجھاجاتاتھا۔چنانچہ کوہِ ندا سے جس آدمی کو پکاراجاتا وہ جسم وجاں سمیت)کسی الوداعی تقریب کا انتظار کیے بغیر"(زرد پہاڑ "کی طرف چلاجاتا۔"[45]

"دنیاکی ہرچھوٹی بڑی چوٹی بلاتخصیصِ ملک وملت باربارسرکرنے کی کوششیں پیہم جاری وساری ہیں۔"[46]

"بے شک شروع شروع میں آپ شکوک وشبہات کاشکاررہتے ہیں۔"[47]

سوال پیداہوتاہے کہ وطنِ عزیز میں جہاں سال بھرموسمی تغیروتبدل کوخاطر میں لائے بغیر پروٹین کی معمولی سی مقدار کے لیے ہربیمارولاچار(مگرحلال)جانورکولقمہ اجل بنادیا جاتاہے۔"[48]

" بس یہی آہنگ اورذات کی وہ اٹوٹ اکائی ہے جوعقدِ انسانیت کومنورکرنے والی ازلی وابدی مسرت کے لمحے کووجودمیں لاتی ہے ۔"[49]

"4آپ ان تمام منازل کی کڑی ازمائشوں سے گزرکراس ڈھیلی ڈھالی نرم ونازک زندگی سے ہمکنارہوں گے۔"[50]

"۔۔۔وہ راکھ ہونے کے بجائے چیختا چنگھاڑتا ہوا اس دیار کو لوٹ جائے۔۔۔"[51]

"ہر بار دلاور خان کا سراپا مختلف سانچوں میں ڈھلتا ہوا نئے رنگ وروپ اختیار کرتا چلا گیا۔"[52]

"ان کے خدوخال کے فرق کو دنیا کا بڑے سے بڑا آرٹسٹ اور قیمتی سے قیمتی کیمرہ بھی نمایاں نہیں کر سکتا۔"[53]

"نہ میں انسان کو دھات کا ایسا ٹکڑا تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں جس کی قدروقیمت کا اندازہ محض چونی اٹھنی کہہ دینے سے لگایا جاسکے۔"[54]

"البتہ میں اپنے تئیں مطمئن ہوں کہ ماں بیٹا جہاں کہیں بھی ہوں گے یقیناً خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔"[55]

"بھول جانے میں سکون وعافیت اور صبر وقرار کے تمام معتدل عناصر پائے جاتے ہیں۔"[56]

پھر ہر کھیل کا ایک ہلکا پھلکا پہلو بھی ہوتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے آپ کو محفوظ ومامون رکھتا ہے۔"[57]

مندرجہ بالا جملوں میں استعمال ہونے والے "تگ وتازِ، اتحاد وارتباط، جسم وجاں، ملک وملت، جاری وساری، شکوک وشبہات، تغیر و تبدل، شوروشغب، نرم ونازک، چیختا چنگھاڑتا، رنگ وروپ، خدوخال، قدروقیمت، خوش وخرم، سکون وعافیت، صبر وقرار، محفوظ ومامون، جسم وجاں، ملک وملت "ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔

مرکب عطفی کے دونوں اجزا کا ایک ہی آواز پر ختم ہونا:

"البتہ مٹھاس کی طلب بچگانہ ذوق وشوق کی نشاندہی کرتی ہے۔"[58]

"اس سے یہ مراد نہیں کہ کوہ پیما اپنا عجیب وغریب لباس زیبِ تن کر کے عمدہ سی تصویر کھنچواتا ہے۔"[59]

"تراش خراش ہی اس ہیرے کی چمک دمک کا اصل راز ہے۔"[60]

مندرجہ بالا جملوں میں استعمال ہونے والے "ذوق وشوق ,عجیب وغریب ,تراش خراش ,چمک دمک" ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔

مرکب عطفی کے دونوں اجزا کا ایک ہی آواز سے شروع ہونا اور ایک ہی آواز پر ختم ہونا:

"آپ اس کا قلع قمع کروانے اور اسے گھر کا راستہ دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔"[61]

"اچانک آپ اس لمحے سے ہمکنار ہوں گے جو مسرت وانبساط کا منبع ومرجع ہے۔"[62]

"وہ بڑی دیر تک میری پیٹھ کو سہلاتے ہوئے میری تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہا۔"[63]

مرقومہ بالا جملوں میں "قلع قمع، منبع ومرجع ،تعریف وتوصیف" ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں اور ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔

تجنیسِ زائد (مرکب کے ایک جزو میں دوسرے جزو سے زائد آواز یا آوازوں کا ہونا)

"چھڑی فہم وفراست اور مردانہ وجاہت کی آئینہ دار ہے۔"[64]

"ان کے قرب وجوار میں کوئی صورت آشنا نظر نہ آئے تو فوراً تاڑ جایئے کہ یہ صاحب اس وقت خودکلامی کے عارضے میں مبتلا نہیں بلکہ بحرِ تصور پر اپنی ناو رکھے ہوئے ہیں۔"[65]

"پروبیشن کیمپ کی خاردار تاریں خس وخاشاک سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں۔"[66]

ان دونوں خبروں کے مابین ربط واتحاد کی بنا پر میرے اپنے مخصوص طرزِ فکر کا وہ پیمانہ ہے جس سے میں دنیا ومافیہا کی ہر مادی وغیر مادی شے کو جانچتا پرکھتا رہتا ہوں۔"[67]

جزوسے زائدآوازیاامذکورہ بالاجملوں میں "فہم وفراست ،قرب وجوار، خس وخاشاک ،ربط واتحاد، دنیاومافیہا" تجنیسِ زائد کی مثالیں ہیں کیونکہ ان جملوں میں مرکب کے ایک جزومیں دوسرے جزوسے زائدآوازیاآوازیں ہیں۔

مصوتی تکرار(مرکب کے دونوں اجزاکے آخر میں وقوع پذیرہونے والے مختلف مصمتوں سے قبل ایک ہی مصوتے کاآنا)

"دیووں عفریتوں سے ٹکراو اورتعمیروتخریب کے اس سنگھم پرانسان نے زندگی کے سنگلاخ حقائق سے چشم پوشی کے لیے نیند کاسہارالیا۔"[68]

"کہ سکائی سکریپر سے گرکرمرنے کی بجائے کسی ندی نالے میں ڈوب مرنا۔۔کہیں زیادہ رومانٹک اور اورکئی وجوہات کی بناپر لائقِ صد تحسین وآفریں ہے۔"[69]

"اس سے یہ مرادنہیں کہ کوہ پیاپناعجیب وغریب لباس زیبِ تن کرکے عمدہ سی تصویر کھنچواتاہے۔"[70]

"البتہ مٹھاس کی طلب بچگانہ ذوق وشوق کی نشاندہی کرتی ہے۔"[71]

"وہ بڑی دیرتک میری پیٹھ کوسہلاتے ہوئے میری تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہا۔"[72]

مذکورہ بالاجملوں میں "تعمیروتخریب تحسین وافریں ،عجیب وغریب ، ذوق وشوق ،تعریف وتوصیف " مصوتی تکرارکی عمدہ مثالیں ہیں کیونکہ ان مرکبات کے دونوں اجزاکے آخر میں وقوع پذیرہونے والے مختلف مصمتوں سے قبل ایک ہی مصوتے کواستعمال کیاگیاہے۔

صرف ونحو کافن کارانہ استعمال (Artistic Usage of Morphology and Syntex)

مرکب کے دونوں اجزا کاایک ہی جزوِ کلام (part of speech) سے تعلق رکھنا:

دونوں اجزا کااسم ہونا:

"وہ تھااوراس کے سامنے آغوش کشاطویل وعریض دھرتی۔"[73]

"اب ان کے لب ولہجہ میں وہ پہلاساجوش بھی نہیں تھا۔"[74]

"بس یہی آہنگ اورذات کی وہ اٹوٹ اکائی ہے جو عقدِ انسانیت کو منور کرنے والی ازلی وابدی مسرت کے لمحے کووجود میں لاتی ہے۔"[75]

"آپ ان تمام منازل کی کڑی آزمائشوں سے گزرکراس ڈھیلی ڈھالی نرم ونازک زندگی سے ہمکنارہوں گے۔"[76]

"ہربارولاورخان کاسراپامختلف سانچوں میں ڈھلتاہوانئے رنگ وروپ اختیارکرتاچلاگیا۔"[77]

"ان کے خدوخال کے فرق کودنیاکابڑے سے بڑاآرٹسٹ اورقیمتی سے قیمتی کیمرہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔"[78]

"نہ میں انسان کودھات کاایساٹکڑاتسلیم کرنے کے لیے تیارہوں جس کی قدروقیمت کااندازہ محض چونی اٹھنی کہہ دینے سے لگایاجاسکے۔"[79]

"البتہ میں اپنے تئیں مطمئن ہوں کہ ماں بیٹاجہاں کہیں بھی ہوں گے یقیناً خوش وخرم زندگی بسرکررہے ہوں گے۔"[80]

"بھول جانے میں سکون وعافیت اورصبروقرار کے تمام معتدل عناصرپائے جاتے ہیں۔ "[81]

پھرہرکھیل کاایک ہلکاپھلکاپہلوبھی ہوتاہے جس کی بدولت انسان اپنے آپ کومحفوظ ومامون رکھتاہے۔"[82]

مرقومہ بالاجملوں میں "طویل وعریض، لب ولہجہ ، شوروشغب، ڈھیلی ڈھالی، نرم ونازک، ،رنگ وروپ، خدوخال، قدروقیمت، ً خوش وخرم، سکون وعافیت، ،صبروقرار،، محفوظ ومامون"ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں ہرمرکب کے دونوں اجزا گرامر کی روسے اسم ہیں۔

دونوں اجزا کاصفت ہونا:

"میں علی الاعلان کہہ رہاہوں کہ مجھے نیند سے کوئی ذاتی بغض وعناد نہیں ہے۔۔۔"[83]

"ایک ایسااحساسِ بے خودی جوخودآگہی کے مطابق مضبوط وتوانا دھارے کامنبع ومرجع ہوتاہے۔"[84]

لیکن افسوس کامقام ہے کہ بچے کی اس جرات واستقلال سے مملوفعل کوتھپکیوں اورلوریوں کے زہرسے الودہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"[85]

"جسے وہ تگ وتازِ حیات میں مختلف کروٹیں دیتارہتاہے۔"[86]

"آپ ان تمام منازل کی کڑی آزمائشوں سے گزرکراس ڈھیلی ڈھالی نرم ونازک زندگی سے ہمکنارہوں گے۔"[87]

پھرہر کھیل کاایک ہلکاپھلکاپہلوبھی ہوتاہے جس کی بدولت انسان اپنے آپ کومحفوظ ومامون رکھتاہے۔"[88]

مندرجہ بالاجملوں میں استعمال ہونے والے مرکباتِ عطفی "بغض وعناد،مضبوط وتوانا، جرات واستقلال ، تگ وتازِ، ڈھیلی ڈھالی، نرم ونازک، محفوظ ومامون" میں سےہرمرکب کے دونوں اجزا گرامر کی روسےاسم صفت ہیں۔

مرکب کے دونوں اجزا کا بحیثت واحد یاجمع ہونا:

"آپ کسی بات کومعمولی سی کوشش سےازبر کرسکتے ہیں لیکن زندگی کے کسی واقعہ کوبھلانے کے لیے ہمیں اپنے جسم وذہن کوتقریباً نئے سرے سے خلق کرناپڑتاہے۔"[89]

"جس کے نزدیک بلندی کے حصول کے لیے روح اور جسم کا مکمل اتحاد وارتباط بے حد ضروری سمجھاجاتاتھا ۔ چنانچہ کوہِ ندا سے جس ادمی کو پکاراجاتا وہ جسم وجاں سمیت)کسی الوداعی تقریب کا انتظار کیے بغیر"زرد پہاڑ "کی طرف چلاجاتا۔"[90]

"دنیاکی ہرچھوٹی بڑی چوٹی بلاتخصیص ملک وملت باربارسرکرنے کی کوششیں پیہم جاری وساری ہیں"[91]

"بے شک شروع شروع میں آپ شکوک وشبہات کاشکار رہتے ہیں۔"[92]

"اب ان کے لب ولہجہ میں وہ پہلاساجوش بھی نہیں تھا۔"[93]

"ہربارولاورخان کاسراپامختلف سانچوں میں ڈھلتاہوانئے رنگ وروپ اختیار کرتاچلاگیا۔"[94]

"ان کے خدوخال کے فرق کودنیاکابڑے سے بڑاآرٹسٹ اورقیمتی سے قیمتی کیمرہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔"[95]

مرقومہ بالاجملوں میں"جسم وذہن، جسم وجاں،ملک وملت، شکوک وشبہات،لب ولہجہ، رنگ وروپ، خدوخال"ایسے مرکبات ہیں جن میں سےہرایک کے دونوں اجزا یا واحدہیں یاجمع ۔

معنیاتی تجزیہ

مرکب کے دونوں اجزا کامترادف ہونا:

"آپ بھکاری کے سوادنیاکے ہرانسان کوپندونصائح اورزجروتوبیخ سے اس کاآبائی پیشہ ترک کردینے پرآمادہ کرسکتے ہیں۔"[96]

"لذت وسرور کی کشیدتودرکنار اس چھچھوندرکواگلنے نگلنے کامسئلہ ہی عزت ووقارکاسوال بن جاتاہے۔"[97]

"اچانک آپ اس لمحے سے ہمکنارہوں گے جومسرت وانبساط کامنبع ومرجع ہے۔ "
98

"لاٹھی دلوں میں جوش وولولہ اورجذبہ پیکار کوابھارتی ہے۔"[99]

"البتہ میں اپنے تئیں مطمئن ہوں کہ ماں بیٹاجہاں کہیں بھی ہوں گے یقیناً خوش وخرم زندگی بسرکررہے ہوں گے۔"[100]

" پھرہر کھیل کاایک ہلکاپھلکاپہلو بھی ہوتاہے جس کی بدولت انسان اپنے آپ کو محفوظ ومامون رکھتاہے۔"[101]

مرقومہ بالاجملوں میں " پندونصائح، زجروتوبیخ، لذت وسرور، عزت ووقار، مسرت وانبساط، منبع ومرجع ، جوش وولولہ، خوش وخرم، محفوظ ومامون " ایسے مرکبات ہیں جن میں سے ہرایک کے دونوں اجزا باہم مترادف ہیں

مرکب کے دونوں اجزا کاقریب المترادف ہونا:

"آپ اپنے ڈیل ڈول اورطاقت کاغلط اندازہ لگانے کی بجائے صبرواستقلال کادامن تھامے رکھیے۔"[102]

"جوگی کاجوگ اس وقت تک تکمیل کے زینہ سے آشنا نہیں ہوپاتا جب تک وہ کسی گھنی چھاوں والے پیڑکے نیچے پورے عزم واستقلال کے ساتھ بیٹھ نہیں جاتا۔"[103]

"دراصل ہم سنگلاخ حقائق سے بھرپور عملی زندگی کااغازکرہی اس لیے پاتے ہیں کہ ہمیں ماہ وسال کے تربت پرہنستامسکراتا ہواوہ لمحہ دکھائی دیتاہے جس میں ہمیں اطمینان اوریکسوئی کے ساتھ بیٹھنانصیب ہوگا۔"[104]

"پھررات دن کی محنت اورجستجو سے اپنے آپ کوتقسیم کرنے کے درپے ہوجاتاہے۔"[105]

"اچانک آپ اس لمحے سے ہمکنارہوں گے جومسرت وانبساط کامنبع ومرجع ہے۔ "
106

"لاٹھی دلوں میں جوش وولولہ اورجذبہ پیکار کوابھارتی ہے جبکہ چھڑی تحمل ،بردباری اورسوچ بچار کوجنم دیتی ہے۔"[107]

"اپنی اجتماعی حالت میں یہ تمام اعضا میرے لیے خوف ووحشت کا باعث بن جاتے ہیں۔ "108

"اس کا اندر، باہر باغِ عدن کے خوش رنگ پھولوں سے مزین ومعطر ہوتا ہے۔۔۔"109

"ان دونوں خبروں کے مابین ربط واتحاد کی بنا پر میرے اپنے مخصوص طرزِ فکر کا وہ پیمانہ ہے جس سے میں دنیاومافیہا کی ہر مادی وغیر مادی شے کو جانچتا پرکھتا رہتا ہوں۔"110

"اور آپ کے خیال میں زیتون کی شاخ امنِ عالم کے قیام وبقا میں کس طرح ممدومعاون ثابت ہو سکتی ہے؟ "

"لذت وسرور کی کشید تو در کنار اس چھچھوندر کو اگلنے نگلنے کا مسئلہ ہی عزت ووقار کا سوال بن جاتا ہے۔"111

"دراصل ہم سنگلاخ حقائق سے بھرپور عملی زندگی کا اغاز کر ہی اس لیے پاتے ہیں کہ ہمیں ماہ وسال کے تربت پر بہستا مسکراتا ہوا وہ لمحہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہمیں اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہو گا۔"112

"پھر رات دن کی محنت اور جستجو سے اپنے آپ کو تقسیم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔"113

"اچانک آپ اس لمحے سے ہمکنار ہوں گے جو مسرت وانبساط کا منبع ومرجع ہے۔ " 114

"لاٹھی دلوں میں جوش وولولہ اور جذبہ پیکار کو ابھارتی ہے جبکہ چھڑی تحمل ، بردباری اور سوچ بچار کو جنم دیتی ہے۔"115

"اپنی اجتماعی حالت میں یہ تمام اعضا میرے لیے خوف ووحشت کا باعث بن جاتے ہیں۔ "116

"اس کااندر، باہر باغِ عدن کے خوش رنگ پھولوں سے مزین ومعطر ہوتا ہے۔"[117]

"ان دونوں خبروں کے مابین ربط واتحاد کی بناپر میرے اپنے مخصوص طرزِ فکر کاوہ پیمانہ ہے جس سے میں دنیاومافیہا کی ہر مادی وغیر مادی شے کو جانچتا پرکھتا رہتا ہوں۔"[118]

اورآپ کے خیال میں زیتون کی شاخ امنِ عالم کے قیام وبقامیں کس طرح ممدومعاون ثابت ہوسکتی ہے

مذکورہ بالا جملوں میں "صبر واستقلال، عزم واستقلال، ربط واتحاد، جانچتاپرکھتا، ممدومعاون، لذت وسرور، ماہ وسال، اطمینان ویکسوئی، محنت اور جستجو، منبع ومرجع، تحمل وبردباری، خوف ووحشت، مزین ومعطر، ربط واتحاد، قیام وبقا" ایسے مرکبات ہیں جن میں سے ہرایک کے دونوں اجزا باہم قریب المترادف ہیں۔

مرکب کے ایک جزو کادوسرے جزو کی رعایت یامناسبت سے آنا۔

"دراصل ہم سنگلاخ حقائق سے بھرپور عملی زندگی کااغاز کرہی اس لیے پاتے ہیں کہ ہمیں ماہ وسال کے تربت پرہنستا مسکراتا ہواوہ لمحہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہمیں اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھنانصیب ہوگا۔"[119]

"جسے وہ تگ وتازِ حیات میں مختلف کروٹیں دیتارہتا ہے۔"[120]

"جس کے نزدیک بلندی کے حصول کے لیے روح اور جسم کامکمل اتحاد وارتباط بے حد ضروری سمجھاجاتاتھا۔چنانچہ کوہِ ندا سے جس ادمی کو پکاراجاتا وہ جسم وجاں سمیت)کسی الوداعی تقریب کا انتظار کیے بغیر"(زردپہاڑ "کی طرف چلاجاتا۔"[121]

"دنیاکی ہرچھوٹی بڑی چوٹی بلاتخصیصِ ملک وملت باربارسرکرنے کی کوششیں پیہم جاری وساری ہیں125"

"بے شک شروع شروع میں آپ شکوک وشبہات کاشکار رہتے ہیں۔"[122]

"پروبیشن کیمپ کی خاردارتاریں خس وخاشاک سے بھی زیادہ ناپائیدارثابت ہوتی ہیں۔"[123]

"اب ان کے لب ولہجہ میں وہ پہلاساجوش بھی نہیں تھا۔"[124]

بس یہی آہنگ اورذات کی وہ اٹوٹ اکائی ہے جو عقدِ انسانیت کو منور کرنے والی ازلی وابدی مسرت کے لمحے کووجود میں لاتی ہے ۔ "[125]

"آپ ان تمام منازل کی کڑی ازمائشوں سے گزرکراس ڈھیلی ڈھالی نرم ونازک زندگی سے ہمکنارہوں گے۔"[126]

"ہربارولاورخان کاسراپامختلف سانچوں میں ڈھلتاہوانئے رنگ وروپ اختیارکرتاچلاگیا۔"[127]

"ان کے خدوخال کے فرق کودنیاکابڑے سے بڑاارٹسٹ اورقیمتی سے قیمتی کیمرہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔"[128]

"نہ میں انسان کودھات کاایساٹکڑاتسلیم کرنے کے لیے تیارہوں جس کی قدروقیمت کااندازہ محض چونی اٹھنی کہہ دینے سے لگایاجاسکے۔"[129]

"البتہ میں اپنے تئیں مطمئن ہوں کہ ماں بیٹاجہاں کہیں بھی ہوں گے یقیناً خوش وخرم زندگی بسرکررہے ہوں گے۔"[130]

"بھول جانے میں سکون وعافیت اورصبروقرار کے تمام معتدل عناصرپائے جاتے ہیں۔"[131]

مذکورہ بالاجملوں میں "ماہ وسال ، تگ وتاز، اتحاد وارتباط، ملک وملت، جاری وساری، شکوک وشبہات،، لب ولہجہ، خس و خاشاک، لب ولہجہ، شورو شغب، ڈھیلی ڈھالی، نرم ونازک،رنگ وروپ ،خدوخال ،قدروقیمت، خوش وخرم، سکون وعافیت، صبروقرار"" ایسے عطفی مرکبات ہیں جن میں سے ہرمرکب کا ایک جزو دوسرے جزو کی رعایت یامناسبت سے آیاہے۔

مرکب کے دونوں اجزا کا مختلف المعنی ہونا:

"اشیائے خوردونوش میں کسی نہ کسی مقدار میں غذائیت تو موجود ہوتی ہے۔"[132]

"اس خلش سے نجات پانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو مردوزن کے سیلِ رواں میں گم کر دیا۔"[133]

"ذاتی طور پر مجھے معاشرے میں افراتفری اور انتشار کی سی حالت پسند ہے کیونکہ ایسی صورتِ حال معاشرے کے عیب وہنر کا صحیح صحیح اندازہ لگانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔"[134]

"سن باتھ اور دھوپ کھانے میں وہی فرق ہے جو مشرق ومغرب میں ہے۔"[135]

"علی الصبح ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد زندگی سے دست و گریباں ہونے کے لیے گھر سے باہر تشریف لے جاتے ہیں۔"[136]

مذکورہ بالا جملوں میں "خوردونوش, مردوزن ,عیب وہنر ,مشرق ومغرب ,دست و گریباں" ایسے مرکبات ہیں جن میں سے ہر ایک کے دونوں اجزا باہم متضاد ہیں۔

4۔ محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال کا تجزیہ

(Analysis of usage of Idioms and Proverbs)

"سلام روستائی توضرب المثل ہے ہی۔۔۔اب کسی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی کھٹکا لگا رہتا ہے۔وہ صاحب چیں بچیں ہوکر نہ کہہ دیں۔۔۔"خیریت ! اتنی گرمجوشی سے ہاتھ ملانے کی اصل وجہ؟"[137]

"میں نے اس سے قبل چائے کی پیالی میں اتنا بڑا طوفان اٹھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"[138]

"یہ کرہ ارض پر انسان کے اولین ایام کی تصویر ہے گویا انسان آسمان سے تو بخیریت تمام گر چکا تھا مگر ابھی تک کھجور میں اٹکا ہوا تھا۔"[139]

"بعض دوستوں کا جنہیں میرے دانت گننے کی ضرورت نہ تھی۔ "ب"[140]

"بیٹھنا سکون اور یکسوئی کی علامت ہے۔اس لیے جب میں کسی کو بیٹھتے ہوئے پاتا ہوں تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔"[141]

"بات صرف اتنی ہے کہ جب میرے بھائی بند علی الصبح ناشتے پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد زندگی سے دست و گریباں ہونے کے لیے گھر سے باہر تشریف لے جاتے ہیں۔تو میں فوراً دھوپ میں پڑی چارپائی کی طرف لپکتا ہوں۔"[142]

"جہاں کی ہر شے اپنی قدرتی حالت میں قینچی،استرے کی مصنوعی تراش خراش سے بے نیاز ہماری راہ تک رہی ہے۔"[143]

"چنانچہ جب آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنی خوں آشام نگاہوں اور سرخ و کبود زبان سے آپ پر پل پڑتا ہے۔"[144]

مرقومہ بالا جملوں میں "سلام روستائی، کھٹکا لگا رہنا، چیں بچیں ہو کر، طوفان اٹھنا، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا ،دانت گننا، دل بلیوں اچھلنا ،ہاتھ صاف کرنا،دست و گریباں ہونا، تشریف لے جانا،راہ تکنا ، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا، پل پڑنا، پیمانہ چھلک پڑنا،" وہ محاورات اور ضرب الامثال ہیں جنہیں مشتاق قمر نے بہت عمدگی اور نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

تشبیہ اور استعارات کے استعمال اور انشاپردازی کے نمونوں کا تجزیہ

"یاد "ایک سلگتی چنگاری ہے جس کے لیے شعلہ فشاں ہونا مقدر ہو چکا ہے۔"[145]

یاد ایک ایسی بے قراری کی کیفیت کا نام ہے جو فرقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کیفیت کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔اور اس کے سوز کو لازمی امر بتایا گیا ہے۔

"بڑھاپا دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس کا تعلق آپ کے داخل سے ہے اور جو خودرو پودے کی طرح آپ کی داخلی سطح پر اگ آتا ہے۔"[146]

اس جملے میں بڑھاپے کو خودرو پودے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کو کوئی خود پر طاری نہیں کرتا بلکہ یہ خودرو پودے کی طرح خود بخود وارد ہو جاتا ہے۔

"جلد ہی آپ کے من کا آزاد کبوتر ایک بار پھر کھلی فضاوں میں قلابازیاں کھانے کو ترسنے لگا ہے۔"[147]

جملہ بالا میں دل کی بے خودی اور ہلچل کا احساس دلانے کے لیے آزاد کبوتر اور اس کی اڑان کی تشبیہ کا استعمال نہایت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

"میری سمادھی کی خبر سن کر میرے احباب کل سہ پہر سے ہونٹوں پر اتہزائیہ مسکراہٹ کے طشت اٹھائے امڈے چلے آرہے ہیں۔"[148]

جملہ بالا میں" مسکراہٹ کا طشت "کے عمدہ استعارے سے بات کو سمجھانا مشتاق قمر ہی کی خوبی ہے۔

"گویا نقب زن نے آپ کی پھلواری سے" نیک نامی "کے سارے پھول چن لیے ہیں اور اب بدنامی کے خالی خولی ڈنٹھل باقی رہ گئے ہیں۔"[149]

مرقومہ بالا جملے میں حجام کے لیے نقب زن، سر کے لیے پھلواری، خوبصورت بالوں کے لیے نیک نامی کے پھول اور ٹوٹے بالوں کے لیے بدنامی کے خالی خولی ڈنٹھل کا استعارہ تخلیق کیا گیا ہے۔

"جسمانی طور پر اگر ہم ہوا کے سمندر میں رہتے ہیں تو ذہنی اعتبار سے ہمارے گردوپیش خوش فہمیوں کے رنگارنگ غباروں کا میلہ لگا ہوا ہے۔۔کچھ غبارے پھوٹتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کے لیے ہزاروں اور غبارے امڈے چلے اتے ہیں۔"[150]

جملہ محولہ بالا میں ہوا کو سمندر سے عمدہ تشبیہ دی گئی ہے اور خواہشات کے لیے رنگارنگ غبارے کا عمدہ استعارہ تخلیق کیا گیا ہے۔ جو مشتاق قمر کی دلکش انشاپردازی کے محاسن کو نمایاں اور استعارات کی عمدہ تخلیق کاری کے فن کو آشکار کرتا ہے۔

خلاصہ

مشتاق قمر کے انشائیوں کے مندرجہ بالا اسلوبیاتی تجزیے سے یہ ثابت ہوا کہ مشتاق قمر کے اسلوب میں مندرجہ ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں:

1۔ مشتاق قمرکااسلوب رواں،سبک اورلطیف ہے۔

2۔ تشبیہات ،استعارات،محاورات اورضرب الامثال کے برمحل استعمال نے ان کی نثر کو دلکش بنادیاہے۔

3۔ اظہار کے جدید تر اندازاور صوتی،صرفی ،نحوی،لغوی، معنوی ، لفظی سطحوں پر نئے لسانی سانچوں کی تصنیع نے ان کے اسلوب کو خوبصورت وپراثر اورنثرکو تخلیقی بنادیاہے۔یہی وجہ ہے کہ مشتاق قمر کے انشایئے ہر دور میں پسندکیے گئے ہیں اورپسندکیے جاتے رہیں گے۔

جمیل آذر کے انشائیوں کااسلوبیاتی جائزہ

جمیل آذر اردو کے مستند،معروف اوربنیادساز انشائیہ نگاروں میں شمارہوتے ہیں۔ان کے انشائیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔وہ مضمون نگار اور نقاد بھی ہیں لیکن یہاں ہم صرف ان کے انشائیوں کا اسلوبیاتی جائزہ لیں گے۔

(1)صوتی تجزیہ(Sound symbolism

صوتی رمزیت(Sound Symbolism)

صوتی رمزیت اسلوب میں صوتی آہنگ اورتازگی پیداکرتی ہے ۔اس میں الفاظ کی صوتی ساخت اور دروبست سے ان کے معنی کااظہارہوتاہے۔ جمیل آذرکے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت صوتی رمزیت بھی ہے۔مثلاً

"زندگی کے تہہ در تہہ پھیلے ہوئے اوراق اورافق درافق سلسلہ روزوشب میں جب آپ ذوق وشوق کے ساتھ شمولیت اختیار کرتے ہیں تومظاہر رنگ وبو اپنے سحر انگیز اسرار آپ پر منکشف کرناشروع کردیتے ہیں۔"[151]

(یہاں" ت"،" ر"،"ق"،"س "کی آوازوں کی تکرار مختلف قسم کے تاثرات پیدا کرتی ہیں مثلاً فطرت کی بے کرانی کااحساس،عبارت میں آبِ جو کی روانی،ایک متاثر کن ردھم وغیرہ)

"حق کے صرف ایک لفظ سے باطل شکست کھاگیااورذلت ورسوائی کی سیاہی اپنے منہ پر لگائے راہِ فراراختیار کر گیا ۔"[152]

(اس جملے میں " س" کی تکرار سرکنے کاتاثردیتی ہے اور"ر"کی تکراررینگنےکااحساس دلاتی ہے ۔اوریوں محسوس ہوتاہے جیسے کسی کے چھپ کر فرار ہونے کی ذلت آمیز شکست کامنظر دکھائی دیتاہو۔)

"یہ وہ ذرائع ہیں جوکشاں کشاں آپ کو اس شگفتہ دوشیزہ کی طرف کے جاتے ہیں۔ "[153]

(اس جملے میں"ش "کی تکرارکسی ریشم بدن شوخ حسینہ کی شبیہ کی طرف ذہن کولے جاتی ہے ۔)

صبح کاتازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کرمیرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتاہے۔"[154]

(اس جملے میں لفظ"کھسک "اور"سرسراہٹ "ایسے الفاظ ہیں جو آہستہ ہوا سے کاغذکے زمین پر چلنے کی آواز کاتاثرپیداکرتے ہیں۔ جب کہ چوہے کے چلنے کی تشبیہ اس تاثر میں مزیداضافہ کرتی ہے۔)

تجنیسِ صوتی(Alliteration) :

کسی جملے یافقرے کے دو یادوسے زیادہ قریب الوقوع الفاظ کا ایک ہی آواز سے شروع ہونا تجنیسِ صوتی کہلاتاہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں تجنیسِ صوتی کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔مثلاً

"چاندنی رات میں چکوری چاند کی روشنی کودیکھ کرنغمے الاپتی ہے۔"[155]

"اخبارہماری بے خبری کی تاریکی کوخبر کی لوسے روشن کرتاہے۔۔"[156]

1۔ قافیہ بندی(Rhyming)

جملوں اورفقروں میں قافیوں کاالتزام بھی اسلوب کی دلکشی کاسبب بنتاہے۔جمیل آذر کے انشائیوں میں بھی متعددمقامات پرقافیوں کا التزام ہے۔البتہ یہ التزام جمیل آذر کے ہاں غیرشعوری طورپرہواہے۔چندمثالیں دیکھیے:

"پھرکتاب کی قیمت اوراپنی جیب کی اجازت کاخیال رکھناپڑتاہے۔"[157]

"میری ہمتوں کی پستی، میرے شوق کی بلندی پر غالب آجاتی ہے۔"[158]

"بلاروک ٹوک آپس میں ہم کلامی وہم زبانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔"[159]

"اورآپ کارابطہ معاشرے کے شجرِ ثمردارکے ساتھ اتناہی استوار وپیوستہ رہے گا۔اس کی ذراسی تنگ دامنی آپ کے عملِ غواصی کوبدمزہ اورکرکراکرسکتی ہے۔"[160]

"فطرت اپنی خاموش اداوؤں سے کہتی ہے کہ تم سب ایک ہو،ایک دوسرے کوتحفے دو۔"[161]

"بچے کے لیے کھلونا،بیوی کے لیے گلے کاہار،دوست کے لیے کتاب ،دشمن کے لیےپیار۔۔۔بھوکے کے لیے روٹی،بے روزگارکے لیےروزی۔۔ "[162]"اب کالحہ موجودرواں دریاہے۔شورمچاتی تیزرفتارندی ہے۔پہاڑوں کی کوکھ سے نکلتاچشمہ ہے اوربلندی سے گرتا جھرنا ہے۔بادِ نسیم کاجانفزاجھونکاہے۔"[162]

جملہ ہائے مرقومہ بالا میں "قیمت، اجازت ۔ پستی، بلندی ۔ زمانہ،روزانہ۔روک، ٹوک ۔ ثمردار، استوار۔ پیوستہ، بدمزہ، کرکرا۔ تنگ دامنی، عملِ غواصی۔ ایک ہو، تحفےدو۔ ہار، پیار۔ روٹی،روزی۔ دریا،چشمہ ۔مچاتی، ندی۔ گرتا، جھرنا ۔ جانفزا جھونکا۔" قافیہ بندی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

2۔ صرفی ونحوی تجزیہ

ساختی متوازیت (Constructional parallelism)

جمیل آذر کی تحریر میں ساختی متوازیت کی چند مثالیں اوران کا تجزیہ ملاحظہ کیجیے:

> کتاب کی ضخامت دیکھ کرمیری قوتِ ارادو متزلزل اور قویٰ مسلوب ہونے لگتے ہیں۔میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی پر غالب آجاتی ہےاورمیں عدیم الفرصتی کا بہانہ کرکے کتاب بصد احترام وادب الماری میں بطورامانت رکھ دیتاہوں۔ "[163]

مرقومہ بالاعبارت میں پہلے دوجملوں کے قریب الوقوع اجزا نحوی ساخت کے اعتبارسے متوازی ہیں یعنی ان میں ساختی متوازیت پائی جاتی ہے۔

اپنے گردوپیش سے باخبر،ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے آگاہ،معاشرتی وسماجی مسائل سے واقف، حالات وواقعات کے نشیب وفراز سے بہرہ ور،دن بھرکے معمولات کوپوراکرنے کے لیے مستعد ہو جاتاہوں۔"[164]

مرقومہ بالا جملے کے پہلے چاراجزامیں ساختی متوازیت پائی جاتی ہے

تضاد(Antithesis) :

جمیل آذر کے انشائیوں میں تضاد کی چند مثالیں دیکھیے:

"اِدھر کھیل شروع ہوااُدھر ماڑدھاڑکا بازار گرم ہوا۔"[165]

"تب آسانیاں تھیں اب ہرقدم پرمشکلات کی چٹانیں کھڑی ہیں۔ "[166]

"تب ہم بے فکر زندگی بسر کرتے تھے۔اب ہم پریشان حال رہتے ہیں۔ "[167]

"تب امن وامان اور محبت وپیار کی خوشبو تھی۔اب جدھر دیکھو دشمنی کا راج ہے۔ایک خوف کی سی فضا ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔"[168]

مرقومہ بالا جملوں میں سے پہلے جملے کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے اور دوسرے حصے میں تضاد کی کیفیت دیکھی جاسکتی ہے۔اگلے تینوں جملوں کو "تب" نے دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔چنانچہ ہر جملے کے دونوں اجزا کے مابین تضاد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

"بعض کی آنکھوں میں خوشی کے اور بعض کی آنکھوں میں غم کے آنسو چھلک رہے ہوتے ہیں۔"[169]

جملہ بالا میں آنسو کی دو متضاد اقسام کا ذکر کیا گیا ہے ایک وہ آنسو جو خوشی کے موقع پر نکلتے ہیں اور دوسرے وہ جو غم کے موقع پر امڈتے ہیں۔

جب کتمِ عدم سے تھرکتی دھڑکتی زندگی کی دلفریب گاڑی یہاں آتی ہے تو پلیٹ فارم کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔لیکن جب دوسرے ہی لمحے عدم کی گاڑی ہم سے زندگی کا نور چھین لے جاتی ہے تو ہم غم کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں۔"[170]

مرقومہ بالا عبارت کے پہلے جملے میں گاڑی کی آمد اور پلیٹ فارم کی رونق اور آخری حصے میں روانگی اور اداسی کے ماحول کا تذکرہ تضاد کی خصوصیت کو واضح کرتا ہے۔

مرکباتِ عطفی کا استعمال(Conjunctional Compound)

مرکباتِ عطفی کا استعمال اسلوب فہمی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔اسلوبیاتی تجزیے میں ان مرکبات کو صوتیاتی، صرفی ونحوی اور معنیاتی سطح پر پرکھنا ایک دلچسپ اور اہم سرگرمی ہے۔جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ انشائیہ کے بانی مشیل دی مونتین کے عطفی اور ترادفی مرکبات کا ایک بڑا اچھا تجزیہ رچرڈ سیس نے اپنے ایک مقالے "Literary Style-A Symposium" میں پیش کیا ہے۔جمیل آذر کے انشائیوں میں استعمال شدہ مرکباتِ عطفی کے اس تجزیے سے ان کے زبان واسلوب کی بے شمار خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔مشتاق قمر کے زبان واسلوب کے تجزیے کی طرز پر جمیل

آذر کے زبان واسلوب کی خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے لیے انہیں بھی تین بڑے زمروں(صوتیاتی ،معنیاتی اور صرفی ونحوی) میں تقسیم کیاجاتاہے

صوتیاتی سطح (Phonetic level)

صوتیاتی سطح پر ہمیں جمیل آذر کے یہاں عطفی مرکبات کی شکل میں تجنیسِ صوتی،مصوتی تکرار،مصمتی تکرار،وزن واہنگ ، قافیہ بندی اور خوش آوازی کی مثالیں اکثر مقامات پر نظر اتی ہیں۔صوتیاتی اعتبارسے مرکباتِ عطفی کا تجزیہ اوران کی درجہ بندی ذیل کے مطابق کی جاسکتی ہے:

ت(جنیسِ صوتی) مرکب عطفی کے دونوں اجزاکاایک ہی آواز سے شروع ہونا

"ہیزلیٹ کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ آپ جب بھی سیروسیاحت کے لیے جائیں توتنہاجائیں۔ "[171]

"یہ وہ تصویرہے جس میں انہوں نے اپنے تن کوسفید گرم کمبل سے مستوروملجوب کیاہواہے۔"[172]

"صحت مندمعاشرے کی تشکیل کے لیے ان زہریلے حشرات الارض کا قلع قمع کرنا ازبس ضروری ہے۔"[173]

"میں نے فوری طورپرتھوڑی بہت دنیاوی مال ومتاع سے اپنے آپ کوسبکدوش کردیا۔۔ "[174]

""یہاں پرنمودونمائش کازوروشور ہے۔"[174]

"وہ ٹھیک پانی سے بھرے کنویں میں غوطہ لگانے میں کامیاب وکامران ہوجاتاہے۔ "
175

"سانپ تونہ صرف دوست نمادشمن ہےبلکہ تنگ وتاریک میدانوں،پہاڑوں اورجنگلوں میں بل میں چھپارہتاہے۔ "176

"کاش انہیں اپنے وطن کی قدروقیمت کااندازہ ہوتا۔ "[177]

"میں نے وقت کولہوولعب میں بے دریغ برباد کیا"[178]

"مگر جو مقام و مرتبہ اس کے شاگرد ارسطو کو ادب کی تنقید و تشریح میں حاصل ہے افلاطون کو نہیں۔ "[179]

"غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے درودیوار کے رنگ وروغن اور نقش ونگار کو بڑے غور و فکر سے تکتے ہیں۔"[180]

مرقومہ بالا جملوں میں "سیر وسیاحت، مستور و محجوب، قلع قمع، مال ومتاع، نمود و نمائش، کامیاب وکامران، تنگ وتاریک، قدر و قیمت، لہو ولعب، مقام و مرتبہ، تنقید و تشریح، درودیوار، رنگ وروغن، نقش ونگار" ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔

مرکب عطفی کے دونوں اجزا کا ایک ہی آواز پر ختم ہونا:

غربت وافلاس اور بیماری وبیروزگاری کے بادل چھٹ جائیں۔ "[181]

"دائیں ہاتھ میں چھڑی ان کے جلال وجمال کی عکاسی کرتے ہیں۔ "[182]

"صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ان زہریلے حشرات الارض کا قلع قمع کرنا ازبس ضروری ہے۔ "[183]

"تبدیل شدہ جسم کی وضع قطع کے پیچھے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"[184]

مرقومہ بالا جملوں میں " بیماری وبیروزگاری، جلال وجمال، قلع قمع، وضع قطع "ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔

مرکب عطفی کے دونوں اجزا کا ایک ہی آواز سے شروع ہونا اور ایک ہی آواز پر ختم ہونا۔

"یوں پلیٹ فارم پر مسافروں کے کام ودہن کو تسکین پہنچانے کے لیے انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ "[185]

اگر اس شعر کی یہی تشریح وتوضیح ہے تو پھر غالب غالب نہ ہوا۔"[186]

وقت اپنے تمام جلال وجمال کے ساتھ میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔۔ "[187]

غربت وافلاس اور بیماری وبیروزگاری کے بادل چھٹ جائیں۔ "[188]

صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ان زہریلے حشرات الارض کا قلع قمع کرنا ازبس ضروری ہے۔ "[189]

"تبدیل شدہ جسم کی وضع قطع کے پیچھے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ "[190]

مرقومہ بالا جملوں میں "بیماری وبیروزگاری، جلال وجمال، ماکولات ومشروبات، تشریح وتوضیح ،قلع قمع، وضع قطع "ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں اور ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔

صرفی ونحوی خصوصیات کا تجزیہ

(Morphological and Syntexic Analysis)

مرکب کے دونوں اجزا کا ایک ہی جزوِ کلام (part of speech) سے تعلق رکھنا:

دونوں اجزا کا اسم ہونا:

"زمان ومکاں کے تمام مفروضے ختم ہوجاتے ہیں۔ "[191]

"روزوشب کی یکسانیت نے صبح وشام کے حسن کو چھین لیا۔ "[192]

"یوں پلیٹ فارم پر مسافروں کے کام ودہن کو تسکین پہنچانے کے لیے انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ "[193]

مرقومہ بالا جملوں میں "زمان ومکاں ،روزوشب، صبح وشام، کام ودہن، انواع واقسام ، ماکولات ومشروبات "ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا گرامر کی رو سے اسماء ہیں۔

دونوں اجزا کا صفت ہونا:

"وہ ٹھیک پانی سے بھرے کنویں میں غوطہ لگانے میں کامیاب وکامران ہوجاتا ہے۔ "[193]

"سانپ تو نہ صرف دوست نما دشمن ہے بلکہ تنگ وتاریک میدانوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں بل میں چھپا رہتا ہے۔ "[194]

"۔۔۔اور حسین و جمیل باندی بھی شامل ہوتی تھی۔ "[195]

"مگر جو مقام و مرتبہ اس کے شاگرد ارسطو کو ادب کی تنقید و تشریح میں حاصل ہے افلاطون کو نہیں۔"[196]

"انگریزی زبان مجھے عالمی تہذیب وثقافت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ "[197]

"یوں پلیٹ فارم پر مسافروں کے کام و دہن کو تسکین پہنچانے کے لیے انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ "[198]

مرقومہ بالا جملوں میں " کامیاب وکامران، تنگ وتاریک، حسین وجمیل، مقام ومرتبہ، تنقید و تشریح ، تہذیب وثقافت، کام و دہن، انواع واقسام، ماکولات ومشروبات" ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب کے دونوں اجزا گرامر کی رو سے اسماء صفت ہیں۔

مرکب کے دونوں اجزا کا بحیثت واحد یا جمع ہونا:

"انواع واقسام کے لذائذ واثمار سے فیضیاب ہوتے ہیں۔"[199]

"کاش انہیں اپنے وطن کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا۔ "[200]

اپنے گردوپیش سے باخبر، ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے آگاہ، معاشرتی وسماجی مسائل سے واقف، حالات وواقعات کے نشیب وفراز سے بہرہ وردن بھر کے معمولات کو پورا کرنے کے لیے مستعد ہو جاتا ہوں۔"[201]

"اخبار تمام حدود وقیود کو پھلانگ کر متنوع موضوعات ومضامین کے پھول آپ کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔"[202]

"مذکورہ شعر میں آئینے علامت ہے لوگوں کی، عزیز واقارب کی، دوستوں اور ہمسائیوں کی۔"[203]

"یوں پلیٹ فارم پر مسافروں کے کام ودہن کو تسکین پہنچانے کے لیے انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ "[204]

مرقومہ بالاجملوں میں "انواع واقسام ,لذائذواثمار،قدروقیمت ,گردوپیش ،حالات وواقعات , حدودوقیود ,موضوعات ومضامین عزیزو اقارب ,ماکولات ومشروبات "ایسے مرکباتِ عطفی ہیں جن میں سے ہر مرکب واحد ہے یا جمع۔

معنیاتی تجزیہ

مرکب کے دونوں اجزا کامترادف ہونا:

"اگروہ چوکالگاتاہے توہماری ٹیم فتح ونصرت سے ہمکنارہوجاتی ہے۔"[205]

"ایک عجیب کیف ومستی میں ڈوب گیا۔"[206]

"اورآپ نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ اس کی قلب سراکے اہم مقام پر متمکن ہوجاتے ہیں۔ "[207]

"بلکہ امن وآشتی کی فضاہموارکر کے اپنی سلطنت کی سرحدوں کومحفوظ بھی کرلیتاتھا۔ "[208]

"ایک سچاشاعراپنی محبوبہ کے حسن وجمال کودلپذیراشعارمیں ڈھال کراسے ہدیہ تبریک پیش کرتاہے۔"[209]

"تحفے اتحادویگانگت کی علامت ہوتے ہیں۔"[210]

"غربت وافلاس اوربیماری وبیروزگاری کے بادل چھٹ جائیں۔"[211]

"اپنی جھوٹی اناورتکبرسے بگڑی شکلوں کے ساتھ ذلیل ورسواہوکرفناکے گھاٹ اترگئے۔"[212]

"اگراس شعر کی یہی تشریح وتوضیح ہے توپھرغالب غالب نہ ہوا۔"[213]

"جووعدہ شکنی،بدعنوانی،رشوت ستانی،درغ گوئی،گالی گلوچ، طنزوتعریض، مکروفریب، منافقت وبے ایمانی،حسدوبغض اور قتل وغارت گری سے ہماری زندگی میں زہر گھولتے ہیں۔"[214]

"امن وخوشحالی کی دیوی ہم پرسوجان سے فریفتہ ہوجائے۔ "[215]

"۔۔۔اور باندی بھی شامل ہوتی تھی۔"[216]

"وہ صرف اورصرف مادی دولت وشہرت اورظاہری عزت ووقارکے مالک تھے۔"[217]

مرقومہ بالاجملوں میں"فتح ونصرت، کیف ومستی، اطمینان وسکون، امن وآشتی،حسن وجمال، اتحادویگانگت، غربت وافلاس ، بیماری وبے روزگاری، ذلیل ورسوا،تشریح وتوضیح ،گالی گلوچ، طنزوتعریض،مکروفریب،منافقت وبے ایمانی،حسدوبغض ،قتل و غارت گری، امن وخوشحالی، حسین وجمیل، دولت وشہرت، عزت ووقار" ایسے مرکبات ہیں جن میں سے ہرایک کے دونوں اجزا باہم مترادف ہیں

مرکب کے دونوں اجزا کاقریب المترادف ہونا:

"جب آپ کسی کواس کی حیثیت اورشخصیت کے مطابق تحفہ پیش کرتے ہیں تواس کادل احساسِ تشکروشادمانی سے جھوم جھوم جاتاہے۔"[218]

"خوبصورت تحفہ وہی ہوتاہے جومحبت واخلاص کاحامل ہو " [219]

"آنکھوں کی چمک اورچہرے کی متانت سے عقل ودانش کانورمترشح تھا۔"[220]

مرقومہ بالاجملوں میں" تشکروشادمانی ،محبت واخلاص ،عقل ودانش، دولت وشہرت ،عدل وانصاف، آئین و قانون" ایسے مرکبات ہیں جن میں سے ہرایک کے دونوں اجزا باہم قریب المترادف ہیں۔

مرکب کے ایک جزو کادوسرے جزو کی رعایت یامناسبت سے آنا۔

"اس سکول کے چاروں طرف اندراور باہردرخت اپنی شان وشوکت کامظاہرہ کررہے ہیں۔"[221]

"اخبارتمام حدودوقیود کوپھلانگ کرمتنوع موضوعات ومضامین کے پھول آپ کے قدموں میں ڈال دیتاہے۔"[222]

ہماری تہذیب و ثقافت کی بنیاد احدیت پرہے۔"[223]

"ہیزلیٹ کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ آپ جب بھی سیروسیاحت کے لیے جائیں توتنہاجائیں۔۔ "[224]

مرقومہ بالاجملوں میں" شان وشوک،حدودوقیود، موضوعات ومضامین، تہذیب و ثقافت ،سیروسیاحت " ایسے عطفی مرکبات ہیں جن میں سے ہرمرکب کا ایک جزو دوسرے جزو کی رعایت یامناسبت سے آیاہے۔

مرکب کے دونوں اجزا کامختلف المعنی ہونا:

"قوموں کے عروج وزوال پرروشنی ڈالتاہوں تومیری باتیں ان کے اوپرسے گذرجاتی ہیں۔"[225]

"اپنے گردوپیش سے باخبر،ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے آگاہ،معاشرتی وسماجی مسائل سے واقف،حالات وواقعات کے نشیب وفراز سے بہر""ہ وردن بھرکے معمولات کوپوراکرنے کے لیے مستعدہوجاتاہوں۔"[226]

"روزوشب کی یکسانیت نے صبح وشام کے حسن کوچھین لیا۔ "[227]

مرقومہ بالاجملوں میں "عروج وزوال ،گردوپیش، نشیب وفراز،روزوشب، صبح وشام "ایسے عطفی مرکبات ہیں جن میں سے ہرمرکب کا ایک جزو،معنی میں دوسرے جزوسے مختلف ومتضادہے۔

خلاصہ

جمیل آذر کے انشائیوں کے مندرجہ بالا اسلوبیاتی تجزیے سے یہ ثابت ہوا کہ جمیل آذر کے اسلوب میں مندرجہ ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں:

1۔ جمیل آذر کااسلوب رواں،سبک اورلطیف ہے۔

2۔ تشبیہات ،استعارات،محاورات اورضرب الامثال کے بر محل استعمال نے ان کی نثر کو تخلیقی بنادیا۔

3۔ اظہار کے جدید تر اندازاور صوتی،صرفی ،نحوی،لغوی، معنوی ، لفظی سطحوں پر نئے لسانی سانچوں کی تصنیع نے ان کے اسلوب کو دلکش اور پراثر بنادیاہے

4۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل آذر کے انشائیے ہر دورمیں پسندکیے گئے ہیں اورپسندکیے جاتے رہیں گے

حوالہ جات

1۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،1986،ص"228

2۔ خلیل احمد بیگ،اسلوبیاتی تنقید-نظریاتی بنیادیں اور تجزیے،قومی کونسل برائے فروغِ اردو،نئی دہلی،اول،2014ء،صx/ix

3..Montaigne,Inequality Which Is Between Us,Essays,translated by Charles Cotton{online}available at http/www.crst.edu.instruct phl 302/texts/Montaigne.n.essay...,April 10 ,2002.

4۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:57

5۔ایضاً،ص:66

6،ایضاً ،ص:66

7۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ) ،مشمولہ جدیداردوانشائیہ ،مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1991ء،ص:107

8۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:71

9۔ ایضاً،ص: 95

10۔مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق، مدیر:وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء، ص:24

11۔ایضاً،ص: 27

12۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:37

13۔ایضاً،ص:37

14۔ ایضاً، ص:38

15۔ ایضاً، ص:38

16۔ ایضاً، ص:39

17۔ ایضاً، ص:47

18۔ ایضاً، ص:120

19۔ ایضاً، ص::108

20۔ ایضاً، ص::67

21۔ ایضاً، ص:68

22۔ ایضاً، ص93:

23۔مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :وزیرآ غا، وزیرا لاہور،ستمبر/ا کتوبر1975ء، ص25:

24۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:69

25۔ ایضاً، ص39:

26۔ ایضاً، ص100:

27۔ ایضاً، ص59:

28۔ ایضاً، ص75:

29۔ ایضاً، ص142:

30۔ ایضاً، ص:77

31۔ مشتاق قمر، خوش فہمی(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،لاہور، جنوری/فروری 1976ء، ص:34

32۔ ایضاً، ص:35

33۔ ایضاً، ص:37

34۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ(،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :آغا، وزیرا لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء، ص24:

35۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص: 40

36۔ ایضاً، ص41:

37۔ ایضاً، ص50:

38۔ مشتاق قمر، خوش فہمی(انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،لاہور، جنوری/فروری 1976ء، ص:37

39۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ(،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :آغا، وزیرا لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:24

40۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء، ص:95

41۔ ایضاً، ص:64

42۔ ایضاً، ص:41

43۔ ایضاً، ص:120

44۔ ایضاً، ص:91

45۔ ایضاً، ص:92

46۔ ایضاً، ص:93

47۔ ایضاً، ص:65

48۔ ایضاً، ص:71

49۔ ایضاً، ص: 76

50۔ ایضاً، ص:60

51۔ ایضاً، ص:60

52۔ ایضاً، ص:80

53۔ ایضاً، ص:82

54۔ ایضاً، ص:83

55۔ ایضاً، ص:112

56۔ ایضاً، ص:112

57۔ ایضاً، ص:90

58۔ ایضاً، ص:

59۔ ایضاً، ص:88

60۔ ایضاً، ص:39

61۔ ایضاً، ص:39

62۔ ایضاً، ص:74

63۔ ایضاً، ص:81

64۔ ایضاً، ص:53

65۔ ایضاً، ص:100

66۔ ایضاً، ص:68

67۔ ایضاً، ص:96

68 ۔ ایضاً، ص:145

69۔ ایضاً، ص:104

70۔ ایضاً، ص:88

71۔مشتاق قمر،ریزگاری (انشائیہ)مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر آغا، وزیرا لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:24

72۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:81

73۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ جدیداردوانشائیہ ،مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1991ء،ص:109

74۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:106

75۔ ایضاً، ص:76

76 ۔ایضاً ،ص:60

77۔ ایضاً، ص:80

78۔ ایضاً، ص:82

79۔ ایضاً،83

80۔ ایضاً، ص:112

81۔ ایضاً، ص:112

82۔ ایضاً، ص:90

83۔ ایضاً،ص:140

84۔ ایضاً، ص:142

85۔ ایضاً،ص:144

86۔ ایضاً،ص:91

87۔ ایضاً،ص:60

88۔ ایضاً، ص:90

89۔ ایضاً،ص:119

90۔ ایضاً، ص92

91۔ ایضاً، ص93

92۔ اایضاً، ص:65

93۔ یضاً، ص106:

94۔ ایضاً، ص80:

95۔ ایضاً، ص82:

96۔ مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :وزیرآ غا ،لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:26

97۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:69

98۔ ایضاً، ص:74

99۔ ایضاً، ص:51

100۔ ایضاً، ص:112

101۔ ایضاً، ص:90

102۔ ایضاً، ص:60

103۔ ایضاً، ص:63

104۔ ایضاً، ص:62

105۔ مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :وزیرآغا، لا ہور،ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:27

106۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:74

107۔ ایضاً، ص:51

108 ۔ ایضاً، ص:81

109۔ مشتاق قمر،پروفیسر،مسئلہ یہ ہے،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا، لاہور، جولائی/اگست، 1979ء،ص:55

110۔مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:96

111۔ ایضاً، ص:134

112۔ ایضاً، ص:165

113۔ مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :وزیرآغا، لا ہور،ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:27

114۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:74

115۔ ایضاً، ص:51

116 ایضاً، ص:81

117۔ مشتاق قمر،پروفیسر،مسئلہ یہ ہے،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا، لاہور، جولائی/اگست، 1979ء،ص:55

118۔مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:96

119۔ ایضاً، ص:62

120۔ایضاً، ص:91

121۔ایضاً، ص:92

122۔ایضاً، ص:65

123۔ایضاً، ص:67

124۔ایضاً، ص:106

125۔ایضاً،ص:125

126۔ایضاً، ص:60

127۔ایضاً، ص:80

128۔ایضاً، ص:74

129۔ایضاً، ص:80

130۔ایضاً، ص:81

131۔ایضاً، ص:132

132۔ایضاً، ص:70

133۔ایضاً، ص:48

134۔ایضاً، ص:84

135۔ایضاً، ص:78

136۔ایضاً، ص:73

137۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ "جدیداردوانشائیہ "مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد19 91ء،ص:108

138۔ ایضاً،ص:108

139۔مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:37

140۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ "جدیداردوانشائیہ "مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد19 91ء،ص:108

141۔ایضاً، ص:63

142۔ایضاً، ص:73

143۔ایضاً، ص:39

144۔ایضاً، ص:60

145۔ایضاً، ص:112

146۔ایضاً، ص:149

147۔ایضاً، ص:42

148۔ایضاً، ص:56

149۔ایضاً، ص:41

150۔ مشتاق قمر، خوش فہمی(انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،لاہور،جنوری/فروری 1976ء، ص:34

151۔ جمیل آذر،شمولیت(انشائیہ)، مشمولہ جدیداردوانشائیہ مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1977ء،ص:112

152۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:134

153۔ ایضاً، ص:117

154۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،(انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء ، ص:29

155۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:54

156۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:31

157۔ ایضاً، ص29:

158۔ ایضاً، ص29:

159۔ ایضاً، ص:30

160۔ایضاً، ص:30

161۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:25

162۔ایضاً، ص:26

163۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،:29

164۔ جمیل آذر،شمولیت)انشائیہ(،مشمولہ جدیداردوانشائیہ مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان، 1977ء،ص:112

165۔ ایضاً ص:112

166۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:116

167۔ایضاً، ص:112

168۔ایضاً، ص:114

169۔ جمیل آذر،ریلوے پلیٹ فارم،مشمولہ ماہنامہ اوراق،لاہور،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری1990 ء ،ص:332

170۔ایضاً،ص:332

171۔ایضاً، ص:331

172۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:64

173۔ ایضاً، ص:35

174۔ ایضاً، ص:126

175۔ ایضاً، ص:130

176۔ ایضاً، ص:132

177۔ ایضاً، ص:139

178۔ ایضاً، ص:151

179۔ ایضاً، ص:59

180۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:30

181۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:27

182۔ ایضاً، ص:64

183۔ ایضاً، ص:35

184۔ ایضاً، ص:124

185۔ جمیل آذر،ریلوے پلیٹ فارم،مشمولہ ماہنامہ اوراق،لاہور،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری 1990ء ،ص:332

186۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص: 39

188۔ ایضاً، ص:27

189۔ ایضاً، ص:35

190۔ ایضاً، ص:124

191۔ جمیل آذر،کچھ لکھنے کے بارے میں، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، لاہور، جولائی/اگست 1979ء،ص :58

192۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:151

193۔ جمیل آذر،ریلوے پلیٹ فارم،مشمولہ ماہنامہ اوراق،لاہور،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری1990ء ،ص:332

194۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:132

195۔ ایضاً، ص:22

196۔ایضاً، ص:59

197۔ ایضاً، ص:110

198۔ جمیل آذر،ریلوے پلیٹ فارم،مشمولہ ماہنامہ اوراق،لاہور،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری 1990ء ،ص:332

199۔ایضاً

200۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:139

201۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:30

202۔ایضاً،ص:30

203۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:41

204۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص30:

205۔ جمیل آذر،شمولیت)انشائیہ(،مشمولہ "جدیداردوانشائیہ "مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد1977ء،ص:111

206۔ ایضاً

207۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص :21

208۔ ایضاً، ص:22

209۔ ایضاً، ص:24

210۔ ایضاً،ص:25

211۔ ایضاً،ص:27

212۔ ایضاً،ص:31

213۔ ایضاً، ص:39

214۔ ایضاً، ص:42

215۔ ایضاً، ص:27

216۔ ایضاً، ص:22

217۔ایضاً، ص:30

218۔ ایضاً، ص:21

219۔ ایضاً، ص:23

220۔ایضاً، ص:76

221۔ ایضاً، ص:111

222۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر: وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:30

223۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:146

224۔ جمیل آذر،ریلوے پلیٹ فارم،مشمولہ ماہنامہ اوراق،لاہور،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری 1990ء ،ص: 331

225۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:51

226۔ جمیل آذر، شمولیت (انشائیہ)، مشمولہ "جدید اردو انشائیہ "مرتب: اکبر حمیدی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد 1977ء، ص:111

227۔ ایضاً، ص:151

باب پنجم

مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا تقابلی جائزہ

پروفیسر مشتاق قمر اور پروفیسر جمیل آذر اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "اردو انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انہوں نے نہ صرف خود بہت خوبصورت انشائیے لکھے بلکہ اس سلسلے میں نئی پود کی تربیت بھی کی۔ چنانچہ اگر آج چمن میں ہر طرف انشائیے کی داستان بکھری ہوئی نظر آرہی ہے اور دم بدم خوبصورت اور تازہ انشائیے لکھے جارہے ہیں تو اہلِ نظر کی طرف سے اس بات کی شاباش ان دونوں ہی کو ملنی چاہیے۔[1]

چونکہ اردو انشائیہ کے میدان میں یہ دونوں اگٹھے داخل ہوئے۔ اردو انشائیے کے لیے دونوں نے اگٹھے کام کیا۔ اور انشائیے کی دنیا میں برابر نام پیدا کیا۔ اس لیے ان دونوں کی انشائیہ نگاری کا تقابلی جائزہ لینا اہمیت کا حامل ہے۔ زیرِ نظر مقالے کے گذشتہ ابواب میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوبیاتی اور موضوعی جائزہ لینے اور ہر دو کے انشائیوں پر مانتین کے تصورِ انشائیہ کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس مقام پر آگیا ہوں جہاں سے میں مونتین کے تصورِ انشائیہ کی روشنی میں ان دو انشائیہ نگاران کے انشائیوں کا تقابلی جائزہ لے سکتا ہوں۔ جائزے کے اس عمل کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے ہر دو انشائیہ نگاران کے انشائیوں کے محاسن و خصائص اور معائب و نقائص کا سامنے لایا جانا ضروری ہے تاکہ ان کے درمیان محاکمہ کیا جاسکے۔ اور یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہر دو میں سے کس انشائیہ نگار نے مانتین سے کتنا اثر لیا ہے؟

مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کے محاسن و خصائص اوران کامانتین کے انشائیوں سے تقابل انکشافِ ذات

انکشافِ ذات مانتین کے انشائیوں کی اہم ترین صفت ہے۔اس کاانفرادی نقطۂ نظراس کی ذات کے انکشاف ہی کاعکس ہے ۔ لیکن اس کے انکشافِ ذات کااس کی آپ بیتی یاخودنوشت سوانح سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے تجربات اور محسوسات کے ذریعے زندگی کے جزویاکل کے متعلق انوکھااور منفرد نقطۂ نظر پیش کرتاہے۔اس طرح وہ زندگی اور کائنات کی ہر چیز کو تفہیم کانیا پیرہن عطاکرتاہے۔اپنے ایک انشائیے میں وہ لکھتاہے:

> I think it less hazardous to write of things past, than present, by how much the writer is only to give an account of things every one knows he must of necessity borrow Upon them.I am solicited to write the affairs of my own time by some, who fancy I look upon them with an eye less blinded with passion than another, and have a clearer insight into themby reason of the free access fortune has given me to the heads of various factions; but they do not consider, that to purchase the glory of Sallust, I would not give myself the trouble, sworn enemy as I am to obligation, assiduity, or perseverance: that there is nothing so contrary to my style, as a continued narrative, I so often interrupt and cut myself short in my writing for want of breath; I have neither

composition nor explanation worth anything, and am ignorant, beyond a child, of the phrases and even the very words proper to express the most common things; and for that reason it is, that I have undertaken to say only what I can say, and have accommodated my subject to my strength. (Translated by Charles cotten) [2]

میری دانست میں موجودہ صورتِ حال کے برعکس ماضی کے بارے میں لکھنا کم خطرناک ہے کیوں کہ اس مقصد کے لیے محض چند حقائق مستعار پیش کر دینے سے کام چل سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے مجھے موجودہ زمانہ کا ماجرا قلمبند کرنے کو کہا ہے کیونکہ ان کی دانست میں دیگر افراد کے مقابلہ میں شدتِ جذبات مجھ میں پریشان نگاہی پیدا نہیں کرتی۔۔۔اس لیے کہ میں اشیاء کا قریبی مشاہدہ بھی کر سکتا ہوں لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ میں یہ کام بھی سرانجام نہیں دے سکتا خواہ مجھے شہرتِ دوام ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ میں توکارِ خیر، فکرِ مسلسل اور مستقل مزاجی کا جانی دشمن ہوں اور لوگوں کو اس کا اندازہ ہی نہیں کہ ایک طویل اور مربوط بیانیہ میرے اسلوبِ حیات سے کتنا غیر متعلق ہے۔ اسی لیے تو بسا اوقات میرا دم ٹوٹنے لگتا ہے جس سے میں رک جاتا ہوں۔ مجھ میں مواد کی مناسب ترتیب اور پیشکش کا سلیقہ بھی نہیں ہے ۔چنانچہ معمولی معمولی باتوں کے اظہار کے لیے بھی مناسب الفاظ اور جملوں کی تلاش کے معاملہ میں میں کسی طفلِ نادان سے کم نہیں ہوں۔ اسی لیے میں صرف وہی کہتا ہوں جو میں کہہ سکتا ہوں۔ میرا مواد میری توانائی کی مناسبت سے ہے۔ (ترجمہ راقم)

انشائیے کا فنی حسن انکشافِ ذات سے ہے۔ انشائیہ نگار کا مشاہدہ جتنا وسیع ہو گا انشائیہ میں اس کی ذات کے حوالے سے اس کی شخصیت کا اظہار اتنا ہی عمدہ ہو گا اور اتنا ہی عمدہ انشائیہ وجود میں آئے گا۔ انشائیہ در حقیقت انشائیہ نگار کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔ مشتاق قمر کے تمام انشائیوں میں انکشافِ ذات کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "مشتاق قمر انشائیے کی اصل روح کو پہچانتے ہیں اور زندگی کی ایک قاش کو کل سے الگ کر کے اس پر ایک ایسے نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔"[۳] ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں "میرے لیے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ مشتاق قمر اردو انشائیہ کا بیکن ہے یا چارلس لیمب لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے جس صنفِ ادب کو متعارف کرایا تھا اسے ایک عمدہ تخلیق کار مل گیا ہے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اب کچھ اور چراغ روشن ہوں گے اب کچھ اور روشنی پھیلے گی"[۴] پروفیسر جمیل آذر کہتے ہیں "مشتاق قمر ہمارے اردو انشائیہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔ اس کے ہاں زندگی کے پیش پا افتادہ موضوعات سے انشائیہ کی قندیلیں روشن ہوئی ہیں۔ چھڑی، آئس کریم کھانا، اور بال کٹوانا معنی آفرینی کے عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔"[۵] عارف عبدالمتین مشتاق قمر کی کتاب "ہم ہیں مشتاق" پر لکھے گئے فلیپ میں لکھتے ہیں۔ "مشتاق قمر کے انشائیوں کی ایک اور اہم صفت یہ ہے کہ ہر چند وہ فلسفہ آرائی سے مملو نہیں ہوتے تاہم ہمیں ان میں ایک خاص نوعیت کے فلسفیانہ اسلوبِ تدبر کا احساس ہوتا ہے جو انہیں رفعت تو عطا کرتا ہے مگر ان کی اس جذباتی یافت کو قطعاً مجروح نہیں ہونے دیتا جسے ان کے ہر انشائیے کے لوازمہ کی حیثیت حاصل ہے۔"[۶] مشتاق قمر کے انشائیے اردو انشائیہ تحریک کا آغاز ہیں۔ اردو ادب میں وزیر آغا کے بعد دوسرے انشائیہ نگار مشتاق قمر تھے جن کے انشائیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر وسیم انجم لکھتے ہیں "انشائیہ تحریک کو وزیر آغا نے شروع کیا تو اس کے ہراول دستے میں مشتاق قمر بھی شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے انشائیے تخلیق کیے جو انمٹ نقوش کے حامل ہیں۔"[۷] مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں کی عمارت مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ کی بنیاد پر رکھی البتہ انہوں نے اس کے میٹیریل میں اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبان و ادب کا بھی اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں کے اسلوب پر اردو انشاء پردازی کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

ایک مثال دیکھیے:

> چھڑی کی معیت میں مجھے اپنی غیر متوازن حالت سے چھٹکارا ملا ہے اور یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں کسی آشرم میں پہنچ گیا ہوں یا مزکسی چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے بعد خراب ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اپنے اندر ایک عجیب سے جذبہ افتخار کی کلبلاہٹ محسوس

ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ اور جدا ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑا پاتا ہوں
اور کوئی شے مجھے ایک زوردار تقریر کرنے پر اکسانے لگتی ہے۔"[۸۱]

اقتباسِ بالا میں مشتاق قمر نے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق چھڑی سے سہارا لینے کے تجربے کو بیان کیا ہے۔ اور انسانی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ چھڑی بالعموم ہر انسان کو اور بالخصوص بوڑھے لوگوں کو کتنا پر اعتماد بنا دیتی ہے۔ انسان اس کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے بغیر اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہے۔ یا جس طرح تسبیح ہاتھ میں لینے سے ذکر کرنے کو من کرتا ہے۔

مانتین کی طرح جمیل آذر نے بھی اپنے انشائیوں میں اپنی زندگی میں حاصل ہونے والے تجربات، محسوسات اور تجربات سے حاصل ہونے والے خیالات کی پیشکش میں بھرپور طریقے سے اپنی ذات کا اظہار اور اپنی شخصیت کا انکشاف کیا ہے۔ بلکہ مانتین سے آگے بڑھتے ہوئے فرانسس بیکن کی طرح انشائیہ کو خارجیت اور زندگی سے بھی مربوط کیا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر بشیر سیفی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں "مجموعی طور پر جمیل آذر کے انشائیے اپنی بے ساختگی، شگفتگی، کھلی کھلی کیفیت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔"[۲۵] ان کے ایک انشائیے سے لیا گیا یہ اقتباس دیکھیے:

صبح کا تازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی
نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔ میرے کان اس کی ہلکی سی جنبش کو بن دیکھے
پہچان لیتے ہیں۔ جس خندہ پیشانی سے یہ میرے کمرے میں نزولِ اجلال فرماتا ہے میں اسی بے
اختیاری کے ساتھ بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور پھر چائے کے گرم شیریں گھونٹوں کے ساتھ
اس کی فتنہ پردازیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔[۲۶]

اقتباس مرقومہ بالا میں جمیل آذر نے نہایت شگفتہ اور بے تکلف انداز میں اخبار کے مطالعے کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اخبار کے بارے میں اپنی پسند اور دلچسپی کی کامیاب لفظی تصویر کشی کی ہے۔ ذات کے اظہار کا یہ انداز ہی انشائی انداز ہے۔ مانتین نے اسی طرح انکشافِ ذات کیا ہے۔

اسلوب

جیسا کہ زیرِ نظر مقالے کے باب سوم میں مشتاق قمر کے انشائیوں کے موضوعاتی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کا اسلوب رواں، سبک، بے ساختہ اور لطیف ہے۔ لہجے میں ایسی بے تکلفی ہے کہ قاری کو یوں لگتا ہے جیسے اس سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ ان کے اسلوب کی لطافت اور شگفتگی کے باعث انشائیہ کو پڑھتے ہوئے طبیعت کو بہجت اور مسرت حاصل ہوتی ہے جس سے انشائیے کا مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ ان کا اسلوب تکلف و تصنع سے پاک اور بے ساختہ ہے۔ ان کے جملوں میں ندی کی روانی ہے۔ مشتاق قمر کے ہاں تجزیے اور موازنے کے عمل کا اظہار داخلی سطح پر ہوتا ہے۔ ان کے انشائیے سستے جذباتی ردِ عمل سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ قاری کی داخلی کیفیت میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ وہ قاری سے اس طرح محوِ گفتگو ہو جاتے ہیں کہ قاری ان کو اپنے برابر میں کسی میز پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ ظاہری سطح پر ان کے اسلوب میں لسانیاتی محاسن اور اسلوبی اوصاف بھی موجود ہیں۔ اسلوب میں مشتاق قمر نے مانتین کی پیروی کس حد تک کی ہے اس کے لیے یہاں مانتین کے ایک انشائیے سے لیا ہوا یہ اقتباس دیکھیے:

> - The most fruitful and natural exetrcise of the mind,in my opinion,is conversation;I find the use of more sweet than of any other action of life;and for that reason it is that,if I were now compelled to choose,I should so I think,consent to loose my sight than my hear and speech The study of books is a languishing and feeble motion that heats not whereas conversation teaches and exercises at once.(translated by C. Cotton) [9]

میری رائے میں ذہن کی فطری اور باثمر مشق گفتگو ہے۔ میں نے اسے زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے زیادہ پر لطف پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت مجھے دیکھنے اور سننے میں سے کسی

ایک چیز کو چننے پر مجبور کیا جائے تو میں دیکھنے کے مقابلے میں گفتگو کو زیادہ پسند کروں گا۔ مطالعہ کتب مردہ دل اور بے ہمت حرکت ہے۔اس حرکت میں آتشناکی نہیں ہے۔اس کے برعکس ایک ہی وقت میں گفتگو ہمیں تعلیم بھی دیتی ہے اور تربیت بھی کرتی ہے۔(ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس میں مانتین دراصل اپنی تخلیقی شخصیت کی توانائی اور اس کی مناسبت سے اپنے رجحانِ طبع کی غمازی کررہا ہے۔اس انکشافِ ذات میں اس کی انکساری نے "میں' کا مفہوم بالکل بدل دیا ہے۔یہاں انانیت، نرگسیت اور خودستائی کا کوئی گذر نہیں۔

ایک اور مقام پر مانتین لکھتا ہے:

Compare with such a one the common rabble of mankind, stupid and mean-spirited, servile, instable, and continually floating with the tempest of various passions, that tosses and tumbles them to and fro, and all depending upon others, and you will find a greater distance than betwixt heaven and earth; and yet the blindness of common usage is such that we make little or no account of it; whereas if we consider a peasant and a king, a nobleman and a vassal, a magistrate and a private man, a rich man and a poor, there appears a vast disparity, though they differ no more, as a man may say, than in their breeches. neither the courage to die nor the heart to live, who will neither resist nor fly, what can we do with him? (OF THE INEQUALITY WHICH IS BETWEEN US Translated by Charles cotton.[27]

انسانوں کے ایک ایسے مشترک ہجوم کا موازنہ کریں جس میں بے وقوف، کم ظرف، غلامانہ ذہنیت کے حامل اور مختلف قسم کے جذبات کے حامل لوگ شامل ہیں جنہیں ان کے جذبات کا طوفان ہمہ وقت اڑاتا ہوا ادھر ادھر اچھالتا اور گراتا پھرتا ہے، اور جن کا تمام تر دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔اور تم اس ہجوم کے لوگوں میں باہم (معاشی، طبقاتی اور معاشرتی سطح کا فاصلہ) زمین اور آسمان کے فاصلے سے زیادہ پاؤگے۔لیکن ہم عام استعمال ہوتے ہوئے اس اندھے پن کا تھوڑا یا زیادہ کچھ بھی حساب نہیں دیتے۔حالانکہ ہم غور کرتے ہیں تو ایک کسان اور بادشاہ، ایک آقا اور غلام، ایک مجسٹریٹ اور ایک عام آدمی ایک امیر اور ایک غریب کے درمیان وسیع عدم مساوات دکھائی دیتی ہے۔ان کی نیکریں دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں جیسا کہ کوئی کہہ سکتا ہے۔نہ ان میں مرنے کی جرات ہے نہ جینے کا جذبہ، جو نہ مزاحمت کریں گے نہ فرار ہوں گے ہم ان کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟(ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس مانتین کے انکشافِ ذات کی خوبصورت مثال ہے۔زندگی سے مربوط یہ فکر انگیز انکشاف اس کے مشاہدے اور احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ اس اقتباس میں طبقاتی نظامِ معاشرت کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔لیکن تازہ، دلچسپ اور شگفتہ انداز میں۔یہی انشائیے کا حسن ہے۔

مشتاق قمر نے بھی اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کا انکشاف اور اپنی شخصیت کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ان کے انشائیوں سے لی گئی یہ مثال ثابت کرتی ہے کہ وہ مانتین سے زیادہ متاثر ہیں۔ان کے ایک انشایے کا یہ اقتباس دیکھیے:

انسان کا کام محض دریاؤں، ندیوں کا رخ موڑنا نہیں بلکہ ان کے کنارے نرم نرم ریت پر سر رکھے، دھوپ کی ننھی ننھی شعاعوں کی شال اوڑھے کچھ دیر کے لیے فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونا بھی ہے۔"[10]

جملہ بالا میں صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ واستعارے کے استعمال نے اس جملے کے اسلوب کی دلکشی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

جمیل آذر کا اسلوب مانتین کے اسلوب کی طرح سادہ، شگفتہ اور لطیف ہے۔ اجمیل آذر کو زبان پر قدرت حاصل تحریر منفرد ہے۔ جس کی تفصیل مذکورہ باب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں مانتین اور جمیل آذر کے انشائیوں سے ان کے اسالیب کی ایک ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

اب ایک مثال جمیل آذر کے ایک انشائیے سے:

> "ایک بڑا سیاسی مدبر اپنی قوم کو غلامی سے نجات دلا کر ایک آزاد وطن کی سوغات دیتا ہے۔ ایک سچا شاعر اپنی محبوبہ کے حسم وجمال کو دلپذیر اشعار میں ڈھال کر اسے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔ ایک مصور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی خوبصورت تصویر اپنے دوست کو تحفتاً دے کر باہم یادوں کو امر کر دیتا ہے۔"[۲۸۱]

مرقومہ بالا اقتباس میں چست، رواں اور شگفتہ جملے جمیل آذر کے سلیس، رواں اور برجستہ اسلوب کی ایک مثال ہے۔ جمیل آذر کے انشائیے ایسی بے شمار مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> صبح کا تازہ اخبار دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔"[۲۹۱]

جملہ بالا میں ایک طرف صوتی رمزیت، ساختی متوازیت، تشبیہ، استعارے اور تکرار کے ساتھ ساتھ مانوس اور کانوں کو بھلے لگنے والے الفاظ اس جملے کے اسلوبیاتی حسن کو چار چاند لگاتے ہیں۔

انشاپردازی

جیسا کہ گذشتہ ابواب میں انشاء پردازی اور انشائیے کے باہمی تعلق پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ مانتین نے بھی انشائیے میں انشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن جہاں تک اردو انشائیے کا تعلق ہے تو اس میں استعمال ہونے والی انشاپردازی فارسی اور عربی سے زیادہ متاثر ہے۔ تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے مشتاق قمر کی نثر کو دلکش بنا دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں میں

اس اردو انشاپردازی کا نہ صرف استعمال کیا ہے بلکہ اس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے کہ انشائیہ کے اسلوب کی روانی، لطافت اور سادگی کو بھی مجروح نہیں ہونے دیتا۔

مشتاق قمر کے ہاں انشاپردازی کے خوبصورت نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ ان کے انشائیوں سے مرقومہ ذیل دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

1۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوگا گویا ستارے ایک عالمِ سوگوار میں ہاتھ مل رہے ہیں۔ چاند کسی کے انتظار میں محوِ حیرت و استعجاب ہے۔ اس کی ضیاپاش نگاہیں تھک چکی ہیں۔ درخت، پتے، ٹہنیاں، لہلہاتے کھیت۔ سڑکیں، پگڈنڈیاں۔ جھرنے چشمے۔ ندی، نالے، دریا۔ فطرت کا ہر عنصر یاسیت اور شکست خوردگی کے احساس تلے کراہ رہا ہے۔[11]

2۔ "اس میں پھول بھی کھلتے ہیں۔ کلیاں بھی چٹکتی ہیں۔ درخت سبز سبز جامے بھی اوڑھتے ہیں اور فطرت کا بے رحم ہاتھ ان سے یہ شگوفے اور کلیاں چھین بھی لیتا ہے۔"[12]

اقتباساتِ بالا میں ظاہری اسلوبیاتی محاسن صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی و معنوی، ساختی متوازیت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ و استعارے کے استعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اسلوبیاتی اوصاف یعنی سبک الفاظ کا چناؤ، اور ایک بہار آفریں ماحول کی تخلیق نے عبارت کو مسحور کن بنا دیا ہے۔ اس تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کی انشاپردازی مانتین کی انشاپردازی کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے ان کی نثر کو دلکش بنا دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں میں اس اردو انشاپردازی کا جس پر عربی و فارسی کے گہرے اثرات ہیں، نہ صرف استعمال کیا ہے بلکہ اس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے کہ انشائیہ کے اسلوب کی روانی، لطافت اور سادگی کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور اس خصوصیت میں مانتین مشتاق قمر یا اردو کے دیگر انشاپردازوں کو نہیں پہنچ سکتا۔

جمیل آذر اپنے انشائیوں میں علمِ بدیع و بیان اور ضرب الامثال کو بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں خوبصورتی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی انشاپردازی کی یہ مثال دیکھیے:

"زندگی کے تہہ در تہہ پھیلے ہوئے اوراق اورافق درافق سلسلہ روزوشب میں جب آپ ذوق وشوق کے ساتھ شمولیت اختیار کرتے ہیں تو مظاہرِ رنگ وبو اپنے سحر انگیز اسرار آپ پر منکشف کرناشروع کردیتے ہیں۔"[۳۰]

مرقومہ بالا اقتباس میں جمیل آذر قافیہ بندی، تکرارِ الفاظ، تشبیہ، استعارے، مرکباتِ عطفی کے خوبصورت استعمال اور مانوس ومترنم الفاظ کے استعمال نے اس جملے کے اسلوب کو شگفتہ اور دلکش بنادیا ہے۔

"اورآپ کارابطہ معاشرے کے شجرِ ثمردار کے ساتھ اتناہی استوار وپیوستہ رہے گا۔اس کی ذراسی تنگ دامنی آپ کے عملِ غواصی کوبدمزہ اور کرکراکرسکتی ہے۔"[31]

"فطرت اپنی خاموش اداوؤں سے کہتی ہے کہ تم سب ایک ہو،ایک دوسرے کوتحفے دو۔"[32]

"بچے کے لیے کھلونا،بیوی کے لیے گلے کاہار،دوست کے لیے کتاب ،دشمن کے لیے پیار۔۔۔بھوکے کے لیے روٹی،بے روزگار کے لیے روزی۔۔ "[33]"اب کالحہ موجودرواں دریاہے۔شورمچاتی تیزرفتارندی ہے۔پہاڑوں کی کوکھ سے نکلتاچشمہ ہے اوربلندی سے گرتا جھرنا ہے۔بادِ نسیم کاجانفزاجھونکاہے۔"[34]

اقتباساتِ بالا میں ظاہری اسلوبیاتی محاسن صوتی رمزیت، تکرارِ لفظی ومعنوی، ساختی متوازی^{2}ت، تجنیس صوتی، قافیہ بندی، تشبیہ واستعارے کے استعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اسلوبیاتی اوصاف یعنی سبک الفاظ کا چناؤ، اورایک بہارآفریں ماحول کی تخلیق نے عبارت کو مسحورکن بنادیاہے۔اس طرح جمیل آذرنے ثابت کیاکہ مغربی انشائیہ مشرق میں آکر کہیں زیادہ دل کش اورخوب صورت ہوگیاہے۔

طنزومزاح

طنزومزاح کے پلصراط پر چل کر انشائیہ کی روح کوتازہ رکھنا مشتاق قمرہی کا خاصہ ہے۔مشتاق قمر کی تحریروں میں تخلیقی توانائی کا بھرپور اظہار نظرآتاہے۔ان کے انشائیے شگفتگی اور تفکر کا حسین امتزاج ہیں۔ان کے خیالات فلسفیانہ ہیں مگر اسلوبِ اظہار شاعرانہ ہے۔ان کے انشائیوں میں طنزومزاح کاوجود توہے مگر مغلوب صورت میں یعنی فقط ایک وسیلہ کے طورپر۔وہ طنزومزاح کو تحریر کاغالب رجحان نہیں بننے دیتے۔وہ فرد اور معاشرے کی کئی

خامیوں کو بھی سامنے لاتے ہیں مگر انہیں مزاح نگار کی طرح استہزائیہ یا طنز نگار کی طرح نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حقیقی انشائی رویہ در حقیقت یہی ہے۔ شگفتگی میں مشتاق قمر نے مانتین کی پیروی کس حد تک کی ہے اس کے لیے یہاں مانتین کے ایک انشائیے سے لیا ہوا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> There is a saying that it is a good thing to have a good name, that is to say, credit and a good repute; but besides this, it is really convenient to have a well-sounding name, such as is easy of pronunciation and easy to be remembered, by reason that kings and other great persons do by that means the more easily know and the more hardly forget us; and indeed of our own servants we more frequently call and employ those whose names are most ready upon the tongue.(translated by Charles Cotton) [13]
>
> مثل مشہور ہے کہ اچھا نام ہونا ایک اچھی چیز ہے، صرف اتنا کہنا ہے، اچھی ساکھ اور اعزاز، لیکن اس کے علاوہ، حقیقتاً اچھی آواز (سے ادا ہونے) والا نام رکھنا آسان (سہولت سے ادا ہونے والا) ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تلفظ کی ادائی اور یاد رکھنے کے لیے آسان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بادشاہوں اور دوسرے عظیم لوگوں کے نام آسانی سے یاد رہتے ہیں اور مشکل سے بھولتے ہیں۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہمیں ہمارے نوکروں کے نام، جنہیں ہم اکثر پکارتے رہتے ہیں، یا وہ ملازمین جن کا نام اکثر ہماری زبان پر آتا رہتا ہے (ہمیشہ یاد رہتے ہیں)۔ (ترجمہ راقم)

مرقومہ بالا اقتباس میں مانتین نے ناموں کے بارے میں شگفتہ اسلوب میں جو کچھ لکھا وہ نہ تو طنز (Satire) کے زمرے میں آتا ہے نہ مزاح (Humor) کے اور نہ سنجیدگی (Seriousness) بلکہ ایک ایسی شگفتگی ہے جس میں قاری پر تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

مشتاق قمر کے انشائیوں کے موضوع اور اسلوب دونوں میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"سکوں کی نغمگی کا اعلیٰ نمونہ آج کے بھکاری کی گدڑی ہے کہ اس میں نہ صرف لاکھوں کی دولت پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ راسخ العقیدہ رکھنے والوں کے لیے روحانی تشنگی کے وافر سامان بھی ہوتے ہیں۔آپ بھکاری کے سوادنیاکے ہر انسان کو پندونصائح اورزجر وتوبیخ سے اس کاآبائی پیشہ ترک کردینے پرآمادہ کرسکتے ہیں۔لیکن نہ توآپ بھکاری سے اس کی گدڑی چھین سکتے ہیں اورنہ ہی اسے کوئی نیاچولاپہننے پر مجبور کرسکتے ہیں۔"[14]

آپ نے دیکھاکہ مشتاق قمر کی تحریر ہلکے پھلکے اوررنگین طرزِبیاں کی حامل ہوتی ہے جسے پڑھنے سے قاری کاذہن نہ تو بوجھ محسوس کرتاہے اورنہ اسے کسی ذہنی ورزش کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے انشائیوں کی تخلیقی تازگی اورتازہ کاری اسے حظ ، مسرت،بہجت اور سکون فراہم کرتی ہے۔ دنیاوی تفکرات، الجھنوں اورتناؤ کوعلاج میسر آتا ہے۔اور قاری نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تسکین بھی حاصل کرلیتاہے۔ایک اوراقتباس دیکھیے:

"نیز تہذیب کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر عورت کی تہذیبی ترقی کی رفتارسست پڑگئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمسری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی عورت ابھی تک تہذیب کے اس شیریں پھل کو چکھ نہیں سکی جسے عرفِ عام میں "گنجے پن" کے نام سے یادکیاجاتاہے۔"[15]

مرقومہ بالااقتباس میں مشتاق قمرنے نہایت شگفتہ اورتازہ اسلوب میں عورت کامردوں کے گنجاپن کی تقلید سے عاجزہونے کو بیان کیاہے۔اس پیراگراف پرمانتین کے مذکورہ بالااقتباس کے اثرات صاف پائے جاتے ہیں۔جوکچھ لکھاگیاہے وہ طنز،مزاح اور سنجیدگی کے بجائے شگفتگی اورتازہ کاری کی ذیل میں ہی آتاہے جومانتین کے انشائیوں کاامتیازہے۔

طنز کااصل مقصدناپسندیدہ افعال یامظاہر کی روک تھام کرناہےاورمزاح جوزندگی کی ناہمواریوں کے شعور کے نتیجے میں پیداہوتاہے۔اس کامقصد بھی ناہمواریوں پر قہقہوں کے ذریعے ایک نرم قسم کی تنقید ہی ہے۔ طنزیہ ومزاحیہ مضامین کو انشائیہ سمجھنے والوں کو یہ غلط فہمی انشائیے کے ایک عنصر "شگفتگی" کی وجہ سے ہوئی ہے۔انشائیہ میں شگفتگی سے مرادیہ ہے کہ کلام میں بیان کیے جانے والے فرسودہ الفاظ ومضامین کو بھی اس چابکدستی اور مہارت سے پیش کیاجائے کہ قاری کوپڑھتے ہوئے ناگواری وفرسودگی محسوس ہونے کے بجائے مسرت وانبساط کااحساس

ہو۔ شگفتگی کا تعلق لفظ اور معنی دونوں سے ہے۔ کلام میں تہہ داری اور گہرائی نہ بھی ہو جب بھی کسی پہلو سے شگفتگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ مزاح اور ظرافت کی شگفتگی عارضی ہوتی ہے جبکہ انشائیے کی شگفتگی دیرپا۔ مزاح کی شگفتگی میں قہقہے لگتے ہیں اور ہنسی چھوٹتی ہے اور آدمی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں جب کہ انشائیے میں پائی جانے والی شگفتگی تبسم کی ایک کیفیت کا نام ہے جو کبھی زیرِ لب اور کبھی پسِ لب ہی رہتی ہے۔ انشائیے میں طنز و مزاح کے وجود کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح پانی کے گلاس میں ایک چمچ دودھ ڈالنے سے پانی کا گلاس دودھ کا گلاس محسوس ہوتا ہے جب کہ اس میں نہ تو دودھ کا ذائقہ ہوتا ہے نہ دودھ کے خواص۔ یہی مثال مانتین کے انشائیوں میں طنز و ظرافت کے وجود کی ہے۔ اس کے ایک انشائیے سے یہ اقتباس دیکھیے:

اگر اس شعر کی یہی تشریح و توضیح ہے تو پھر غالب غالب نہ ہوا۔"[35]

مرقومہ بالا جملہ میں مزاح و ظرافت کا وجود تو ہے مگر جملے پر اس کا غلبہ نہیں بلکہ یہ جملہ زیرِ لب تبسم کی کیفیت کا حامل ہے۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"مغربی جدید استعماریت بھی ایک سانپ ہے جس نے جنتِ ارضی کے حسن کو پامال کر دیا ہے۔ جس طرح سانپ کینچلی بدل بدل کر نت نئے روپ اختیار کرتا ہے، ماڈرن امپیریل ازم نے بھی کینچلی بدل بدل کر نت نئے روپ اختیار کرتا ہے۔"[36]

جملہ بالا میں جدید استعماری نظام پر طنز کی گئی ہے مگر اس طنز میں کاٹ نہیں بلکہ ہلکی پھلکی طنز ہے۔ انشائیے میں طنز و مزاح کا وجود بس اتنا سا ہے ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔

موضوعات میں تنوع

مانتین کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اس کے ایجاد کردہ انشائیوں کی کامیابی اس کی تازگی، انوکھے پن اور رنگارنگی میں ہی پوشیدہ ہے۔ اس کے موضوعات کی وسعت پوری زندگی اور تمام کائنات پر محیط ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو ہماری سامنے کے دنیا اور ہماری معمول کی زندگی سے تعلق تو رکھتے ہیں مگر یہ لوگوں کی توجہ کا مرکز کم ہی بنتے ہیں یا قارئین کی نگاہیں انہیں ان زاویوں سے کم ہی دیکھتی ہیں۔

مانتین کے تصورِ انشائیہ کے مطابق انشائیہ نگار کے انشایئے متنوع موضوعات پر تحریر ہونے چاہییں۔ جس طرح وہ اداسی، غم، ناراضی، خوف، غصہ، نفع، دیانت، دوستی، سینیکا اور پلوٹارک کا دفاع جیسے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور انہیں شاداب، تازہ اور رنگارنگ بنادیتا ہے۔ مشتاق قمر نے بھی اپنے انشائیوں کے لیے مانتین کی طرح رنگارنگ اور متنوع موضوعات چنے ہیں۔ انہوں نے کائنات کی مختلف النوع اشیاء، مظاہر، خیالات اور جذبوں کو موضوع بنایا ہے۔ مشتاق قمر جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اسے شاداب، تازہ اور رنگارنگ بنادیتے ہیں۔ مشتاق قمر نے متنوع اور بوقلموں موضوعات پر انشایئے لکھے۔

ذیل میں ان کے انشائیوں کے موضوعات دیکھیے:

"بال کٹوانا"، "چھڑی"، "بیٹھنا"، "آئس کریم کھانا"، "دھوپ کھانا"، "تبدیلی نام"، "کوہ پیمائی"، "لونا نہم"، "بھول جانا"، "بڑھاپا"، "اپالوٹریجڈی"، "کچھ نیند کی مذمت میں"، "شہرت کی مخالفت میں"، "مرزا غالب--زندگی کی ساتویں جہت"، "میرا کتب خانہ"، "پھل کھانا"، "بلاوجہ"، "خوش فہمی"، "ریزگاری"، "اقبال کی ایک تصویر وغیرہ۔

جمیل آذر نے بھی رنگارنگ اور مختلف اقسام کے موضوعات پر انشایئے لکھے۔ اشیاء ہوں یا واقعات انہوں نے مخفی مفاہیم کے انکشاف کرنے اور انوکھے زاوی ے سے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ شاخِ زیتون"، "شمولیت"، "مچھلی کا شکار"، "رت کے مہمان"، "وقت اے وقت"، "روشنی اے روشنی"، "تحفے"، "کھوکھلے لوگ"، "جنریشن گیپ"، "غالب، میں اور مردم گزیدہ"، "اشتہارزدہ لوگ"، "ناشر، مدیر اور ادیب"، "اقبال، غالب اور رومی"، "تمباکو، بارود اور ایٹم"، "فیلٹ ہیٹ سے جناح کیپ تک"، "کرپشن کا دیو استبداد"، "جاوداں ہوں میں"، "شوقِ آوارگی"، "کیا یہاں کوئی ہے؟"، "نشہ"، "ہیومن کینن ہال"، "اردو، پنجابی اور انگریزی"، "اب اور تب---آئینہ تمثال دار"، "جنریشن گیپ"، "لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا"، "شیر اور سانپ"،، "حسن، سچائی اور قربانی"، "کچھ علالت کے بارے میں" وغیرہ

علامت نگاری

مشتاق قمر انشائیہ نگار ہی نہ تھے بلکہ وہ افسانہ نگار، ناول نویس، ڈرامہ رائٹر، شاعر اور نقاد بھی تھے۔ان کے اکثر افسانے علامتی ہیں۔چنانچہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں بھی علامت نگاری سے کام لیا ہے۔بیٹھنا سکوت اور یکسوئی کی علامت ہے۔انشائیہ "کوہ پیمائی" میں کوہ پیمائی کو انہوں نے انسان کی بلندی کی طرف جانے اور ترقی کی راہ پر چلنے کی فطری خواہش کی علامت کے طور پر چنا ہے۔انشائیہ "مرزا غالب۔ زندگی کی ساتویں جہت" میں مرزا غالب کو بے فکر اور آزاد منش انسان کے لیے علامت کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔انشائیہ "بال کٹوانا" میں بال کٹوانے کو مہذب معاشرے، جدت اور تبدیلی کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔انشائیہ "چھڑی" میں چھڑی کو سہارا، فہم وفراست اور مردانہ وجاہت کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔انشائیہ "بیٹھنا" میں بیٹھنے کو ارتکازِ توجہ، یکسوئی اور فکر وتدبر کی علامت کے طور پر برتا۔انشائیہ "تبدیلی نام" میں ایسے انسان کو علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ نام بدل لینے سے انسان بدل جاتا ہے اس لیے وہ نام بدل لینے ہی کو کافی سمجھ لیتا ہے۔

مسرت آفرینی/شگفتگی

ماتنین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت مسرت آفرینی اور بہجت افزائی ہے۔اس کی تحریر پڑھ کر قاری پر تبسم زیرِلب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اور قاری نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تسکین حاصل کرتا ہے۔یہی وہ کیفیت ہے جسے شگفتگی کہتے ہیں جو درحقیقت تخلیقی نثر اور تازگی کا امتزاج ہوتا ہے۔ماتنین کے انشائیوں سے برآمد ہونے والے اصول کے مطابق ایک انشائیے کا بنیادی مقصد قاری کو تحیر آمیز مسرت اور استعجاب سے محظوظ کرنا ہے۔مشتاق قمر اپنے انشائیوں میں اشیاء کے مخفی مفاہیم کو ظاہر کرکے اور ان کے نئے اور انوکھے پہلوؤں کو سامنے لا کر قاری کو اسی حیرت بھری مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں جو انشائیے کا خاصہ ہیں۔ان کے انشائیوں سے مسرت آفرینی کی ایک مثال دیکھیے:

> میں نے عرصہ ہوا ایک خواب دیکھا تھا۔اتفاق کی بات ہے بالکل یہی خواب میرے ایک دوست کو بھی دکھائی دیا تھا۔میرا یہ دوست مالدار تھا اور تصور کی قوت سے ناآشنا۔وہ اس حسین خواب کو زرق برق لباس پہنا، ڈولی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔نتیجے کے طور پر اب چھ بچوں کی پرورش کی سزا بھگت رہا ہے۔[۱۶]

مرقومہ بالا جملہ میں ظرافت ومزاح تو ہے لیکن اسے پڑھ کر قہقہہ کے بجائے تبسم زیرِلب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اور یہی انشائیہ کی شگفتگی اور مسرت آفرینی ہے۔ جس طرح اوپر ذکر کیے گئے مانتین کے انشائیوں کے اقتباسات میں مسرت آفرینی اور شگفتگی (تخلیقی تازگی) کی خصوصیت واضح دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح جمیل آذر کے انشائیے بھی اس خصوصیت سے مملو ہیں۔یہ مثال دیکھیے: طرح

صبح کا تازہ اخبار اوپر ذکر کیے گئے مانتین کے انشائیوں کے اقتباسات میں مسرت آفرینی اور شگفتگی (تخلیقی تازگی) کی خصوصیت دروازے کے نیچے سے کھسک کر میرے کمرے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ کسی نہایت بے تکلف چوہے کی طرح داخل ہوتا ہے۔میرے کان اس کی ہلکی سی جنبش کو بن دیکھے پہچان لیتے ہیں۔جس خندہ پیشانی سے یہ میرے کمرے میں نزولِ اجلال فرماتا ہے میں اسی بے اختیاری کے ساتھ بڑھ کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور پھر چائے کے گرم شیریں گھونٹوں کے ساتھ اس کی فتنہ پردازیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔۲

اقتباس مرقومہ بالا میں جمیل آذر نے نہایت شگفتہ اور بے تکلف انداز میں اخبار کے مطالعے کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اخبار کے بارے میں اپنی پسند اور دلچسپی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اظہار کا یہ انداز ہی شگفتگی کہلاتا ہے۔

بے ربطی/منتشر الخیالی

بے ربطی سے مراد انشائیہ نگار کی منتشر الخیالی ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں میں بے ربطی ایک اہم صفت کے طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بظاہر موضوع سے دور ہوتے ، کبھی دوسرے موضوعات کو چھیڑتے اور کبھی ایک بات نامکمل چھوڑ کر دوسری بات شروع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔البتہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضوع سے اس کا ایک مخفی ربط بھی قائم ہے۔مشتاق قمر کے انشائیوں سے بے ربطی کی مثال دیکھیے:

اپنے انشائیے "بال کٹوانا" میں بالوں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے کتابوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں:

> "کتابوں کا مطالعہ نئی تہذیب کی کسوٹی ہے۔ ابھی تک تو کتابوں کے متعلق جمہوری طریقہ رائج ہے، یعنی انہیں گنتے ہیں تولتے نہیں لیکن زمانے کی انداز بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ دو واضح طبقے پیدا ہو گئے ہیں ایک طبقہ اپنی تصانیف کی ضخامت کو کم سے کم اور دوسرا زیادہ سے زیادہ کرنے کی طرف مائل ہے۔"[۱۷]

اقتباسِ بالا میں بال کٹوانا کے موضوع کو چھوڑ کر کتابوں پر بات بظاہر بے ربط نظر آتی ہے مگر مذکورہ انشائیہ مکمل طور پر پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ نئی تہذیب پر گفتگو میں بال کٹوانے اور کتابیں پڑھنے میں تبدیلی کا عمل مشترک ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں پائی جانے والی بے ربطی دراصل مانتین ہی کے تصورِ انشائیہ کی دین ہے۔ انشائیے کی بے ربطی دیکھیے کہ جمیل آذر اپنے انشائیے "نیم پلیٹ" میں نیم پلیٹ پر گفتگو کرتے کرتے روئے سخن سائن بورڈوں کی طرف موڑ دیتے ہیں:

"خدا بھلا کرے ان موجدوں کا جنہوں نے نیون لائٹ کی ایجاد سے اشتہار بازی یا سازی کے شوق کو اتنا فروغ بخشا کہ رات کی گھمبیر تاریکی میں یہ جگمگ کرتے سائن بورڈ راہ گیر کی توجہ اس طرف اپنی جانب منعطف کرتے ہیں جس طرح کوئی حسین اور چنچل دوشیزہ اپنے اندازِ دلربائی سے۔۔۔"[۳۱]

ایک اور انشائیے "مچھلی کا شکار" میں کہ بات مچھلی کے شکار پر ہو رہی ہوتی ہے کہ اچانک وہ لفظ "چانس" کو موضوعِ گفتگو بنا لیتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

" لیکن جہاں تک چانس والے معاملہ کا تعلق ہے میں مرزا صاحب سے سو اسولہ آنے متفق ہوں مگر ٹھہریے! کیا ہم چانس کی سحر کاری کو اپنی زندگی سے جلاوطن کر سکتے ہیں؟ کیا مرشد صاحب سے میری دوستی چانس کی مرہونِ منت نہیں؟ کیا ہمارا کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آنا بذاتِ خود چانس کا کرشمہ نہیں؟"[۳۲]

اختصار/کفایتِ لفظی

انشائیے کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔اانشائیہ کو موضوع کے لحاظ سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی مختصر ہونا چاہیے۔نہ اس میں دلائل کے انبار، نہ لمبے چوڑے وعظ، نہ علمی و فلسفیانہ بحث مباحثہ اور نہ بے جا طوالت ہو۔وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرے۔مانتین کے انشائیوں کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔اس کے انشائیے موضوع کے لحاظ سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی مختصر ہوتے ہیں۔نہ اس میں دلائل کے انبار، نہ لمبے چوڑے وعظ، نہ علمی و فلسفیانہ بحث مباحثہ اور نہ بے جا طوالت ہوتی ہے۔وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرتا ہے۔مشتاق قمر کے اکثر انشائیے اختصار کی اس خصوصیت سے محروم ہیں۔ان کے اکثر انشائیے بالخصوص "بال کٹوانا"، "لونا نہم" اور "اپالوٹریجڈی" وغیرہ طوالت کا شکار ہو گئے ہیں۔البتہ مشتاق قمر کے انشائیوں میں طوالت کے باوجود کفایتِ لفظی سے کام لیا گیا ہے۔آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک ہی انشائیے میں بیک وقت طوالت اور اختصار کے موجود ہونے کا کیا مطلب ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ان انشائیوں کے طویل ہونے کی وجہ مصنف کی موضوع کے زیادہ سے زیادہ گوشوں کو سامنے لانے کی خواہش ہے۔ورنہ ان انشائیوں کا ہر گوشہ اپنی جگہ اختصار اور کفایتِ لفظی کا حامل ہے۔اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان طویل انشائیوں میں بھی قاری بور نہیں ہوتا بلکہ اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔چنانچہ میں یہ کہوں گا کہ مشتاق قمر کے انشائیوں میں طوالت کا ہونا ان کی خامی نہیں ہے بلکہ انشائیے میں ان کا اجتہادی کارنامہ ہے۔ دوسری طرف ان کے متعدد مختصر انشائیے بھی موجود ہیں جن میں سے "بلاوجہ"، "ریزگاری"، "خوش فہمی"، "بڑھاپا"، کچھ نیند کی مذمت میں" وغیرہ اختصار کے مانتینی اصول کے عین مطابق ہیں۔دراصل زمانی ترتیب سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کی انشائیہ نگاری کا سفر جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں اختصار، کفایتِ لفظی اور فنی پختگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔پس ابتدائی دور کے انشائیوں کو چھوڑ کر مشتاق قمر کے اکثر انشائیے اختصار کی عمدہ مثالیں ہیں۔

جمیل آذر کے انشائیوں میں اختصار کی خصوصیت مشتاق قمر کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ان کے انشائیے موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے مختصر ہوتے ہیں۔وہ بات کو کفایتِ لفظی

کے ساتھ جامع اورخیال آفریں صورت میں پیش کرتے ہیں۔اوریہی خوبی مانتین کے انشائیوں کی شان ہے۔ملاحظہ کیجیے ان کے انشائیوں کے مجموعے "شاخِ زیتون"،""،"رت کے مہمان"،"وقت اے وقت"،اور"،"روشنی اے روشنی"۔

گپ شپ کاانداز

مانتین کے انشائیوں کی ایک خاص بات اس کاگپ شپ کاانداز ہے۔انشایئے کوپڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتاہے جیسے کوئی شخص ساری مصروفیتوں سے فارغ ہوکرپرسکوں ماحول میں دوستوں سے گپ بازی میں مصروف ہے۔اوراسی گپ شپ میں وہ زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں کوبیان کرتاچلاجاتاہےاوریوں کہ دوستوں کو محسوس بھی نہیں ہوپاتاکہ وہ کیاکچھ سیکھ چکے ہیں۔مانتین کے ایک انشایئے سے لیاگیایہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

- The most fruitful and natural exetrcise of the mind,in my opinion,is conversation;I find the use of more sweet than of any other action of life;and for that reason it is that,if I were now compelled to choose,I should so I think,consent to loose my sight than my hear and speech ...The study of books is a languishing and feeble motion that heats not,where - as conversation teaches and exercises at once[18]

میری رائے میں ذہن کی فطری اور باثمر مشق گفتگوہے۔میں نے اسے زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے زیادہ پرلطف پایاہے۔یہی وجہ ہے کہ اگرکسی وقت مجھے دیکھنےاور سننے میں سے کسی ایک چیز کو چننے پر مجبور کیاجائے تو میں دیکھنے کے مقابلے میں گفتگو کو زیادہ پسند کروں گا۔مطالعہ کتب مردہ دل اور بے ہمت حرکت ہے۔اس حرکت میں آتشناکی نہیں ہے۔اس کے برعکس ایک ہی وقت میں گفتگو ہمیں تعلیم بھی دیتی ہےاور تربیت بھی کرتی ہے۔(ترجمہ راقم)54

مشتاق قمر بھی اپنے انشائیوں میں گپ شپ میں زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں کو بیان کر جاتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کے ایک انشائیے کے اس اقتباس کا مطالعہ کیجیے:

"سکوں کی نغمگی کا اعلیٰ نمونہ آج کے بھکاری کی گدڑی ہے کہ اس میں نہ صرف لاکھوں کی دولت پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ راسخ العقیدہ رکھنے والوں کے لیے روحانی تشنگی کے وافر سامان بھی ہوتے ہیں۔آپ بھکاری کے سوا دنیا کے ہر انسان کو پند و نصائح اور زجر و توبیخ سے اس کا آبائی پیشہ ترک کر دینے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو آپ بھکاری سے اس کی گدڑی چھین سکتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی نیا چولا پہننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"[۱۹]

مذکورہ بالا اقتباس میں بظاہر انشائیہ نگار گپ شپ لگا رہا ہے لیکن وہ در حقیقت پیشہ ور بھکاری کی فطرتِ ثانیہ بننے والی عادت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے احساس دلا رہا ہے کہ احساسِ ندامت سے محروم شخص کو کسی پیشے کی عزت یا اہمیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

"نیز تہذیب کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر عورت کی تہذیبی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمسری کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کوئی عورت ابھی تک تہذیب کے اس شیریں پھل کو چکھ نہیں سکی جسے عرفِ عام میں "گنجے پن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"[۲۰]

مرقومہ بالا اقتباس میں بھی گپ شپ میں کئی گہری باتیں سمجھا دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ فطرت سے ہر جگہ بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ ہر چیز کی حقیقی خوبصورتی کا دارومدار اس کا فطری حالت میں ہونا ہی ہے۔

جس طرح اوپر ذکر کیے گئے مانتین کے انشائیوں کے اقتباسات میں گپ شپ کا انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح جمیل آذر بھی اپنے انشائیوں میں گپ شپ میں گہری باتیں کر جاتے ہیں۔ یہ مثال دیکھیے:

چند روز سے میرے پڑوس میں ایک صاحب نے اپنے نو تعمیر شدہ مکان کے باہر بڑی فن کاری سے ایک نیم پلیٹ آویزاں کر رکھی ہے۔ پلیٹ پر لکھے حروف کو حوادث سے محفوظ کرنے کے لیے اس پر ایک شیشہ چڑھا دیا گیا ہے، جیسے کوئی تصویر فریم میں لگا دی گئی ہو اور ٹیلکم پوڈر پر عمل

کرتے ہوئے شیشے کے اندرایک ودد چھوٹا سابلب بھی نصب کردیاگیاہے۔رات کویہ بلب عجب عشوہ وانداز سے آنکھ مچولی کرتاہے اورہرراہروسے کچھ اس طورسے نظرَ التفات کی درخواست کرتاہے کہ آپ صاحبِ خانہ کے نام کو پڑھنے پرخود کو مجبوراوربے بس پاتے ہیں۔۳۶

اقتباس بالا میں جمیل آذرشہرت کے دلدادہ اورنرگسیت کے شکار لوگوں کی ذہنیت کانفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔اکثر لوگوں کے پاس وہ صلاحیت یاتخلیقی ذہن نہیں ہوتا جوانہیں لوگوں کی نظروں میں نمایاں مقام دلوائے۔پس ایسی لوگ احساسِ کمتری کاشکار ہوکر خودنمائی پر اترآتے ہیں۔دیکھیے جمیل آذرگپ شپ میں ایسے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں اورفلسفیانہ فکر عطاکرتے ہیں۔

دعوتِ فکر

مانتین کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت قاری کے اسپِ فکر کو مہمیز کرنااوراسے تحقیق وجستجو کی طرف راغب کرناہے۔وہ مضمون نگارکی طرح قاری کو خودسارااکام کرکے نہیں دیتابلکہ کچھ کام خود کرتاہےاور کچھ قاری کے کرنے کے لیے چھوڑدیتا ہے۔ مشتاق قمر کے انشائیوں میں بھی غوروفکرکی دعوت دی گئی ہےَمثال کے طورپرانشائیہ "تبدیلی نام" میں وہ اس بات پر فکروتدبر کی دعوت دیتے ہیں کہ کیاانسان کے نام بدل لینے سے اس کی فطرت، جسمانی ساخت یانفسیات پر کوئی اثرپڑتاہے یانہیں؟انشائیہ "کوہ پیمائی" میں "کوہِ ندا"اور "زرد پہاڑ" کی علامتوں اوران کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔انشائیہ "لونانہم" میں اس بات پر سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں کہ کیادرندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے والا،چرندوں کی طرح حرام حلال وجائزناجائز چیزوں کو کھانے،پرندوں کی طرح جہازوں میں اڑنے، سیاروں کی طرف سفر کرنے اور سمندری مخلوق کی طرح بحری جہازوں اور کشتیوں میں سیر کرنے سے ہی انسان اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے یااس کے اشرف المخلوقات ہونے کی کوئی اوروجہ ہے؟

مانتین کے انشائیوں کی اتباع کرتےہوئے جمیل آذر نے بھی اپنے انشائیوں میں قاری کو تحقیق و جستجو کی طرف راغب کیاہے۔مثال کے طورپران کےانشائیے"نیم پلیٹ" میں قاری کواس

بات پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کیاواقعی نیم پلیٹ سے کسی کی شخصیت کابہتر مطالعہ کیاجاسکتاہے؟یاچہرو اس عمل میں زیادہ سودمند ثابت ہوسکتاہے؟ انشائیے "نیم پلیٹ" میں ا جمیل آذرنے غیر محسوس طریقے اورلطیف انداز میں قاری کوافلاطون کے مشہور فلسفہ نقل ،لوحِ محفوظ اورنیم پلیٹ کے باہمی تعلق پر غوروفکرکرنے کی دعوت دی ہے۔انشائیہ "شمولیت" میں آمریت کی مذمت ہی نہیں کی گئی بلکہ اسے سخت نفرت کانشانہ بنایاگیاہے۔یوں قاری کو آمریت اورجمہوریت کی خوبیوں وخامیوں پرغور کرنے کی طرف متوجہ کیاگیاہے۔ایک اور انشائیہ"کھوکھلے لوگ" میں جمیل آذر قاری کی توجہ حریصِ زر طبقے کی فطرت کی طرف مبذول کررہے ہیں تاکہ وہ حرص وہوس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بے سکون اوراضطراب بھری زندگی پر غورکرکے اس سے دوررہنے کی کوشش کرے۔

مشتاق قمرکے انشائیوں کے معائب ونقائص

طوالت

انشائیے کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔اانشائیہ کو موضوع کے لحاظ سے بھی اوراسلوب کے لحاظ سے بھی مختصر ہوناچاہیے۔نہ اس میں دلائل کے انبار،نہ لمبے چوڑے وعظ،نہ علمی وفلسفیانہ بحث مباحثہ اورنہ بے جاطوالت ہو۔وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اورخیال آفریں صورت میں پیش کرے۔ابتدائی دور کے انشائیوں کوچھوڑکرمشتاق قمرکے اکثرانشائیے اختصار کی خصوصیت سے مالامال ہیں۔ان کے چند انشائیے بالخصوص "بال کٹوانا"،"لونانہم"اور"اپالوٹریجڈی" وغیرہ طوالت کاشکارہوگئے ہیں۔البتہ مشتاق قمرکے انشائیوں میں طوالت کے باوجود کفایتِ لفظی سے کام لیاگیاہے۔آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک ہی انشائیے میں بیک وقت طوالت اوراختصارکے موجودہونے کاکیامطلب ہے؟اس کاجواب یہ ہے کہ ان انشائیوں کے طویل ہونے کی وجہ مصنف کی موضوع کے زیادہ سے زیادہ گوشوں کو سامنے لانے کی خواہش ہے۔ورنہ ان انشائیوں کاہر گوشہ اپنی جگہ اختصاراور کفایتِ لفظی کاحامل ہے۔اوراس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان طویل انشائیوں میں بھی قاری بور نہیں ہوتابلکہ اس کی دلچسپی برقراررہتی ہے۔چنانچہ میں یہ کہوں گاکہ مشتاق قمرکے ہاں طوالت کاہونااان کی خامی

نہیں ہے بلکہ انشائیے میں ان کا اجتہادی کارنامہ ہے۔ دوسری طرف ان کے متعدد مختصر انشائیے بھی موجود ہیں جن میں سے بالخصوص "بلاوجہ"، "ریزگاری"، "خوش فہمی"، "بڑھاپا"، "میرا کتب خانہ "، "پھل کھانا"، "کچھ نیند کی مذمت میں" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وغیرہ اختصار کے مانتینی اصول کے عین مطابق ہیں۔ دراصل زمانی ترتیب سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق قمر کی انشائیہ نگاری کا سفر جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے ان کے انشائیوں میں اختصار، کفایتِ لفظی اور فنی پختگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

مزاح نگاری اور شگفتگی میں فرق نہ کرنا

ڈاکٹر بشیر سیفی اپنی کتاب "اردو میں انشائیہ نگاری" میں مشتاق قمر کے انشائیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں: [۲۱] "ڈاکٹر بشیر سیفی کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن اس کی توجیہ یہ ہے کہ کہ مشتاق قمر نے مانتین کی ایک صفت "خود احتسابی اور منکسر المزاجی" کا اتباع کیا ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں ڈاکٹر صاحب نے مشتاق قمر کے ایک انشائیے کے جس اقتباس کو پیش کیا ہے میری اس بات کو درست ثابت کرنے کے لیے وہی اقتباس کافی ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنے انشائیے اور طنز و مزاح کے فرق کو اپنے تنقیدی مضامین میں واضح کرتے ہیں۔ اس کے لیے ان کا مضمون "انشائیہ نگاری" [۲۲] دیکھیے۔ لہٰذا ڈاکٹر بشیر سیفی کا یہ اعتراض بے دلیل ہے۔

انشائیوں کی تعداد

مشتاق قمر کی انشائیہ نگاری پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کا ایک ہی انشائی مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" شائع ہوا اور وہ بھی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جبکہ جمیل آذر کے چار انشائی مجموعے طبع ہوئے۔ اس اعتراض کا پہلا جواب یہ ہے کہ "ہم ہیں مشتاق" کے بعد مختلف رسائل میں ان کے انشائیے شائع ہوتے رہے جن میں سے، "ریزگاری"، "خوش فہمی"، "بڑھاپا"، "میرا کتب خانہ "، "پھل کھانا"، "اقبال کی ایک تصویر" "بلاوجہ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ مشتاق قمر کی توجہ افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، تنقیدی و مزاحیہ مضمون

نگاری وغیرہ پر بھی رہی جب کہ جمیل آذر صرف انشائیہ اور تنقید لکھتے رہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ مشتاق قمر سے لے کر تک برین ٹیومر کے مرض میں مبتلا رہے اور اس دوران میں انہوں نے لکھنا لکھانا بالکل ہی چھوڑے رکھا۔

جمیل آذر کے انشائیوں کے معائب و نقائص

انکشافِ ذات کے لیے "میں" کا استعمال نہ کرنا

جمیل آذر کے انشائیوں پر ایک اعتراض یہ ہے کہ جمیل آذر کے اکثر انشائیے انکشافِ ذات یا ذات کے پوشیدہ گوشوں کے اظہار یا واحد متکلم میں اظہار جو انشائیے کا لازمی جز ہے، سے محروم ہیں۔ ڈاکٹر اسلم ادیب یہ اعتراض کرتے ہوئے ان کے انشائیہ "غیر معروف شہری" کا مندرجہ ذیل اقتباس "پیش کرتے ہیں جس میں کہیں واحد متکلم نہیں۔

> "ماڈرن دور کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ آپ کو پیہم یہ احساس دلاتا ہے کہ آپ بے نام، بے چہرہ، غیر معروف شہری ہیں اور گوشت پوست اور روحِ لطیف سے مملو معزز انسان نہیں ہیں۔ کنڈکٹر آپ کو اپنی گربہ چشمی سے سواری میں تبدیل کر دیتا ہے اور دفتری تقاضے آپ کو شناختی کارڈ کے نمبروں میں بدل دیتے ہیں۔"[۲۳]

اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "یہ پیرا گراف سننے کے بعد آپ مشکل سے بتا سکیں گے کہ اس میں تخلیقی سرگرمی کہاں ہے۔ انکشافِ ذات کتنا ہے۔ غیر مقصدیت کہاں ہیں۔ اور جس مضمون کا یہ اقتباس ہے وہ ام الاصناف کیسے ہے۔"[۲۴] ڈاکٹر صاحب موصوف مکمل طور پر انشائیے کو شناخت کرنے سے قاصر ہیں۔ جہاں تک انشائیے کو ام الاصناف کہنے کا تعلق ہے یہ نقطہ نظر صرف مشکور حسین یاد کا ہے جبکہ ان کے علاوہ تمام سربرآوردہ ناقدینِ انشائیہ اور انشائیہ نگار اس بات میں مشکور حسین یاد سے متفق نہیں ہیں۔ باقی رہا واحد متکلم کا استعمال تو انکشافِ ذات کے لیے واحد متکلم ضروری نہیں۔ شخصیت کا اظہار اور ذات کا انکشاف بالواسطہ بھی کیا جا سکتا ہے (یعنی 'میں' کا استعمال نہ کرتے ہوئے بھی)۔ انکشافِ ذات کے بارے میں خود جمیل آذر لکھتے ہیں "ذات کی اہمیت کا عمل دخل جتنا انشائیہ میں اہم ہے، شاید ہی کسی اور صنفِ اظہار میں ہو۔ انشائیہ نگار اپنے تجربات، اپنے احساسات، اپنا رجحان، فکر، اپنی تخلیق میں آزادانہ طور پر عیاں کرتا ہے۔"[۲۵] اسی پیرا گراف میں وہ انشائیہ کی تعریف

کرتے ہوئے لکھتے ہیں "زندگی کے متنوع پہلوؤں کو فکری تجسس اور وجدانی ادراک کے ساتھ گرفت میں لا کر لطیف اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام انشائیہ ہے۔"[44] گویا انشائیہ نگار اپنی ذات پر پڑنے والے اپنے تجربات اور محسوسات کے اثرات کا اظہار کسی بھی صیغہ میں کر سکتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس بھی انشائیہ نگار کی وارداتِ ذات کا اظہار ہے۔

طنز کا غلبہ اور شگفتگی کی کمی

جمیل آذر کے انشائیوں میں اکثر اوقات طنز کا غلبہ محسوس ہوتا ہے بالخصوص آخری انشائی مجموعہ "روشنی اے روشنی" کے انشائیوں میں۔ جبکہ اس مجموعے کے اکثر انشائیے قاری کو مغموم کر دیتے ہیں۔ بظاہر اس مجموعے میں شگفتگی کا فقدان اور طنز کا وفور ہے۔ جیسا کہ میں نے زیرِ نظر مقالے کے باب اول میں حزنیہ لے کے حوالے سے گفتگو کی تھی اور ورجینیا وولف کے ایک انشائیے کی مثال بھی دی تھی کہ حزنیہ لے یا فکری گداز (pathos) وہ کیفیت ہے جس سے انشائیے میں دل سوزی اور جاں گدازی کی ہلکی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں اسلوب تو تازہ اور شگفتہ رہتا ہے مگر انشائیہ نگار کی فکر میں سوز و گداز کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں بعض مقامات پر یہی حزنیہ لے شگفتگی کی کمی پوری کرتی ہے۔ اور جہاں تک طنز کے غلبے کا تعلق ہے جمیل آذر کے انشائیے نہ تو طنز نگار کی طرح کسی کی جبیں پر سلوٹیں لاتے ہیں اور نہ مزاح نگار کی طرح قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ ہنسائیں بھی تو زیادہ سے زیادہ مسکراہٹ لا سکتے ہیں ورنہ اندر ہی اندر محظوظ و مسرور کر دیتے ہیں کیونکہ طنزیہ تحریر جذبات کو بھڑکاتی ہے اور مزاحیہ تحریر انہیں سرد کرتی ہے جب کہ انشائیہ انہیں اعتدال پر لاتا ہے۔ جمیل آذر کے انشائیوں میں جذبات کا یہی اعتدال ایک شگفتہ انداز لیے مسرت بکھیرتا نظر آتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

> سکول کے زمانہ طالب علمی میں جب بیمار نہیں ہوتا تھا تو دعائیں مانگ مانگ کر اس محبوبہ دلبر کو دعوت دیتا تھا۔ اس کے پیچھے منطق یہ ہوتی تھی کہ سکول جانے کے عذاب سے چند دن نجات مل جاتی تھی۔ اور گھر کے سب افراد کا خصوصی طور پر ہم توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔"[45]

مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا تقابل و محاکمہ

مشتاق قمر اور جمیل آذر دونوں کے انشائیوں کے محاسن اور معائب کے مطالع کے بعد ہر دو انشائیہ نگاران کے انشائی کام کا تقابل و محاکمہ مرقومہ ذیل نکات کی صورت میں پیشِ خدمت ہے:

- مشتاق قمر اور جمیل آذر دونوں نے ایک ہی وقت میں انشائیہ لکھنا شروع کیا۔ دونوں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریکِ انشائیہ کا ہراول دستہ تھے۔ دونوں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ دونوں نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا تھا اور دونوں اقبال کی طرح مغربی ادب سے مرعوب نہیں ہوئے۔
- مشتاق قمر کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ساری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر پرسکوں ماحول میں دوستوں سے گپ بازی میں مصروف ہے۔ اور اسی گپ شپ میں ہی وہ زندگی کے فلسفے کی گہرائیوں کو بیان کرتا چلا جاتا ہے اور یوں کہ دوستوں کو محسوس بھی نہیں ہو پاتا جب کہ جمیل آذر کے ہاں اس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ ان کے اکثر انشائیوں کی سنجیدگی ہے لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ قاری کو اجنبیت محسوس ہونے لگے۔
- دونوں انشائیہ نگاروں نے طنز و مزاح کے پلصراط پر چل کر انشائیہ کی روح کو تازہ رکھا ہے۔ دونوں کی تحریروں میں تخلیقی توانائی کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔ دونوں کے انشائیے شگفتگی اور تفکر کا حسین امتزاج ہیں۔ دونوں نے طنز و مزاح کو تحریر کا غالب رجحان نہیں بننے دیا۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا وجود تو ہے مگر مغلوب صورت میں یعنی فقط ایک وسیلہ کے طور پر۔ البتہ ابتدائی دور کے انشائیوں میں مشتاق قمر نے مزاح اور جمیل آذر نے طنز کا استعمال مہارت سے نہیں کیا لیکن جلد ہی سنبھل گئے۔
- مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں میں پائی جانے والی شگفتگی، مزاح و ظرافت کی شگفتگی سے الگ تھلگ ہے یہ شگفتگی قاری کو تبسم زیرِ لب یا پسِ لب کے ذریعے بڑی دیر تک مسرت و بہجت عطا کرتی ہے۔
- مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کا اسلوب رواں، سبک، بے ساختہ، سادہ، شگفتہ اور لطیف ہے۔ دونوں کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ مشتاق قمر کا اسلوب بے تکلف ہے جبکہ جمیل آذر کے اسلوب میں کھلی کھلی کیفیت ہے۔

- مشتاق قمر اور جمیل آذر کے تمام انشائیوں میں انکشافِ ذات کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ دونوں حیات کے مختلف پہلوؤں کو گرفت میں لا کر لطیف اور مسرت افروز انداز میں پیش کرنے کے لیے ذہنی غور و فکر اور تدبر و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔
- دونوں نے اپنی نثر کو دلکش بنانے کے لیے تشبیہات، استعارات، محاورات اور ضرب الامثال کا بر محل استعمال کیا ہے۔
- اظہار کے جدید تر انداز اور صوتی، صرفی، نحوی، لغوی، معنوی، لفظی سطحوں پر نئے لسانی سانچوں کی صناعی نے ان دونوں کے اسلوب کو خوبصورت اور پر اثر اور ان کی نثر کو تخلیقی بنا دیا ہے۔
- مشتاق قمر اور جمیل آذر نے متنوع اور بوقلموں موضوعات پر انشائیے لکھے۔ کائنات کی جس چیز، مظہر، خیال یا جذبے کو موضوع بنایا اسے ایسے رخ سے دکھایا جو لوگوں کے لیے نیا اور انوکھا تھا۔ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں میں علامت نگاری سے زیادہ کام لیا جب کہ جمیل آذر اس کوچے میں کم ہی داخل ہوئے ہیں البتہ وہ دوسروں کی علامتوں کی تشریح ضرور کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنے انشائیوں "کھوکھلے لوگ"، "غالب، میں اور مردم گزیدہ"، "کیا یہاں کوئی ہے؟" وغیرہ میں کیا ہے۔
- مشتاق قمر کے اکثر انشائیے طویل ہیں لیکن مختصر انشائیے بھی موجود ہیں۔ اس کے برعکس جمیل آذر کے زیادہ تر انشائیے مختصر ہیں لیکن طویل انشائیے بھی موجود ہیں جب کہ مانتین کے ہاں مختصر انشائیے زیادہ اور طویل انشائیے کم ہیں۔
- مشتاق قمر اور جمیل آذر اپنے انشائیوں میں اشیاء کے مخفی مفاہیم کو ظاہر کر کے اور ان کے نئے اور انوکھے پہلوؤں کو سامنے لا کر قاری کو حیرت بھری مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔
- بے ربطی کی خصوصیت مشتاق قمر اور جمیل آذر کے تمام انشائیوں میں پائی جاتی ہے۔
- مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے مختصر ہوتے ہیں۔ وہ بات کو کفایتِ لفظی کے ساتھ جامع اور خیال آفریں صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مشتاق قمر کے ابتدائی دور کے انشائیوں میں طوالت کی خامی ہے مگر بعد میں انہوں نے اس کمزوری سے نجات حاصل کر لی تھی۔ جبکہ جمیل آذر شروع سے ہی اس سقم سے مبرا تھے۔

➢ مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت قاری کو تحقیق و جستجو کی طرف راغب کرنا ہے۔اس خصوصیت میں دونوں کے انشائیے مساوی ہیں۔

مندرجہ بالا تقابلی جائزے سے ثابت ہوا کہ مشتاق قمر اور جمیل آذر دونوں ہی جدید انشائیہ کے پیشرو ہیں اور مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ کے مطابق دونوں نے انشائیہ لکھا البتہ مانتین کے مغربی انشائیے کو مشرق کے رنگ میں رنگنے کی کامیاب کوشش کی اور اس میدان میں اپنا مقام تسلیم کروایا۔البتہ مشتاق قمر کے انشائیے شگفتگی،علامت نگاری،نئے اور انوکھے انداز میں دیکھنے کی خصوصیت میں جمیل آذر کے انشائیوں سے زیادہ آگے ہیں جب کہ جمیل آذر کے انشائیے اسلوب،دعوتِ فکر،بے ساختگی،موضوعاتی دائرے کی وسعت کی خصوصیات میں مشتاق قمر کے انشائیوں سے زیادہ بلند معیار کے حامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور،1990ء،ص:۶۷

۲۔ .Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at. http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

3۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکروخیال،لاہور،1990ء،ص:18

4۔ انور سدید،ڈاکٹر،پہلا پتھر (دیباچہ)،ہم ہیں مشتاق،مصنف:پروفیسر مشتاق قمر،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون، 1970ء ،ص:36

5۔ جمیل آذر،انشائیہ اور انفرادی سوچ،نقش گر پبلیکیشنز،راولپنڈی،۲۰۰۴ء ص: ۸۲

6۔ عارف عبدالمتین،فلیپ،ہم ہیں مشتاق، مصنف:مشتاق قمر،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء

۷۔ مشتاق قمر،ایک دن کاآدمی،مرتب:ڈاکٹر محمد وسیم انجم،انجم پبلشرز،کمال آباد، راولپنڈی، ۱۹۹۹ء،ص:۳۶

۸۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:51

۹۔ .Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at. http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

۱۰۔ مشتاق قمر،ریزگاری(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر :آغا، وزیرا لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:75

11۔ ایضاً، ص142:

12۔ ایضاً، ص:77

۱۳۔ .Montaigne, Of Names,,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at.

http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

۱۴۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، لاہور،ستمبر/اکتوبر 1975ء، ص:26

۱۵۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء،ص:43

۱۶۔ پروفیسر جمیل آذر،انشائیہ اورانفرادی سوچ، نقش گر پبلیکیشنز،راولپنڈی،بہار ۲۰۰۴ء،ص۴۸/۴۹

۱۷۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون1970 ء،ص:40

18۔ .Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at.

http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

۱۹۔ مشتاق قمر،(ریزگاری)انشائیہ،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا، لاہور،ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:26

۲۰۔ مشتاق قمر،پروفیسر، ہم ہیں مشتاق،مکتبہ اردوزبان،سرگودھا،جون 1970ء،ص:43

21۔ بشیر سیفی،ڈاکٹر،اردو میں انشائیہ نگاری،نذیر سنز پبلشرز،لاہور۱۹۸۹ء،ص۲۶۴

22۔ مضمون"انشائیہ نگاری "مشمولہ" انشائیہ کے سروکار"ڈاکٹراحمد امتیاز،ایم۔آر پبلیکیشنز،نئی دہلی، اول،۲۰۱۲ء۔ص۱۹۳

۲۳۔ راؤشفیق احمد(مرتب)،انتخاب انشائیہ نمبر،اسلامیہ یونیورسٹی،بہاولپور،

۲۴۔ ایضاً

۲۴۔ .Montaigne,Of the Art of Conferring,essays. Translated by Charles Cotton {online} available at. http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

۲۵۔ بشیر سیفی،ڈاکٹر،اردو میں انشائیہ نگاری،نذیر سنز پبلشرز،لاہور۱۹۸۹ء،ص۲۶۴

۲۶۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

27۔ .Montaigne, Of The Inequality Which Is Between Us,esays.translated by Charles Cotton {available at}http:/www.orst. edu/instruct./phl 302/texts.montaigne.in essay..., April 10 , 2002

28۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص۲۴

۲۹۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،ستمبر/اکتوبر1975ء،ص:29

30۔ جمیل آذر، شمولیت(انشائیہ)، مشمولہ جدیداردوانشائیہ مرتب:اکبرحمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان،1991،ص:122

31۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق، مدیر: وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:30

32۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق، مدیر:وزیرآغا، لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،ص:25

33۔ ایضاً، ص:26

34۔ جمیل آذر،اخبارپڑھنا، ماہنامہ (انشائیہ)، مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،لاہور، ستمبر/اکتوبر 1975ء،:29

35۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:23

۳۶۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:133

۳۷۔ جمیل آذر، مچھلی کاشکار،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،جنوری/فروری،1976ء،ص:39

۳۸۔ جمیل آذر، نشہ(انشائیہ)،ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیرآغا،مئی/جون،1983ء،ص:42

39۔ ایضاً،ص:45

40۔ جمیل آذر،روشنی اے روشنی،مقبول اکیڈمی،لاہور،2015ء،ص:42

41۔ اسلم ادیب، ڈاکٹر، انتخاب انشائیہ نمبر ،مرتب: ڈاکٹر شفیق احمد،،شعبہ اردو،اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور،اول،۱۹۸۸ء،ص۱۳

42۔ ایضاً

43۔ پروفیسر جمیل آذر،انشائیہ اورانفرادی سوچ، نقش گرپبلیکیشنز،راولپنڈی،بہار۲۰۰۴ء،ص۴۸/۴۹

44۔ ایضاً

45۔ جمیل آذر، روشنی اے روشنی، مقبول اکیڈمی، لاہور، 2015ء، ص:18

ماحصل

مقالہ ہذامیں یہ بات متحقق ہوئی ہے کہ اردوانشائیہ کوانگریزی کے پرسنل/لائٹ ایسے سے لیاگیاہے جسے فرانسیسی فلسفی اورادیب مشیل دہ مانتین نے assai کے نام سے شروع کیاتھاجب کہ انشائیہ کانام عربی کے لفظ انشاسے اخذ کیاگیاہے۔انشائیہ کے دھندلے نقوش مانتین کے ہم عصر اردوادیب ملاوجہی کی تصنیف "سب رس" میں بھی پائے جاتے ہیں اور مضمون کی شیلی کی حیثیت سے یہ سرسیداحمد خاں سے لے کر محمد حسین آزاد، شرر لکھنوی، میر ناصر علی ابوالکلام آزاد، سجادحیدر یلدرم، مرزامحمد سعید،، مہدی افادی، بشیراحمد، خلیقی دہلوی ، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی سجاد حیدریلدرم، ابوالکلام آزاد ،مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی اور مجتبیٰ حسین تک لکھاجاتارہالیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جس شخص نے انشائیہ کو اردو میں ایک صنف کی حیثیت سے اس کا حقیقی مقام دلوایا وہ ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔انشائیے کی تحریک چلانے اور انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ سامنے لانے کا کام وزیر آغا کے ہاتھوں ہی سرانجام پایا۔ یہ وزیر آغا کی اپنی تخلیقی توانائی ، تنقیدی شعور اور مخلصانہ سعی کا نتیجہ تھا کہ انشائیے نے اردو ادب میں ایک علیحدہ صنف کی حیثیت پائی۔ مشکور حسین یاد بھی جدید انشائیہ کے بانیوں میں شامل ہیں۔ البتہ انشائیہ میں ان کا تصور اور طریق کار جدید انشائیہ اور مضمون کا امتزاج ہے جس پر کبھی طنزومزاح غالب آجاتا ہے کبھی سنجیدگی جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہوجاتا ہے کہ یہ سنجیدہ مضمون ہے یا طنزیہ یا انشائیہ۔ مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی میں فرق یہ ہے کہ نظیر صدیقی صرف طنزیہ انشائیہ لکھتے ہیں جبکہ یاد سنجیدہ انشائیہ لکھتے ہیں تو وہ سنجیدہ مضمون بن جاتا ہے اور طنزیہ انشائیہ لکھتے ہیں تو وہ طنزیہ مضمون بن کے رہ جاتا ہے۔ صرف چند ایسے انشائیے ہیں جو صنف انشائیہ کے زمرے میں داخل ہیں۔ اس لئے مشکور حسین یاد کو انشائیہ نگاروں میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ نیز ان کے ہاں انشائیہ کا تصور بدلتا رہتا ہے کبھی وہ اسے ام الاصناف کہہ کر اس کی انفرادیت ہی ختم کردیتے ہیں اور کبھی اردو ادب میں انشائیے کے وجود سے ایسے ہی انکار کر دیتے ہیں جسطرح کلیم الدین احمد اردو شاعری کی بعض اصناف کے وجود کو عدم میں بھیج دیتے

ہیں۔ مشکور حسین یاد کا انشائیہ کبھی بیکن کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور بیکن Essay کا موجد ہے نہ کہ Essai (انگریزی کا پرسنل لائٹ ایسے)کا ، اور کبھی برٹرینڈرسل کے مضامین کے زیادہ قریب جو کہ طنز نگار ہے۔ مشکور حسین یاد انشائیے کی تعریف میں کبھی بالکل درست سمت میں بھی رواں دواں ہوتے ہیں ۔مشکور حسین یاد موضوع کو چھوڑتے نہیں لیکن اسے ڈھیلا ضرور چھوڑدیتے ہیں۔ وہ موضوع کو نئے انداز میں دیکھتے۔ نکتہ آفرینی اور مخفی مفاہیم تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔جہاں تک نظیر صدیقی کا تعلق ہے وہ نظری طور پر انشائیہ کو مضمون سے الگ صنف تو تسلیم کرتے ہیں مگر طنزیہ مزاحیہ مضمون اور انشائیے میں عملاً فرق نہیں کرتے۔وزیر آغا کی تحریک نے جن انشائیہ نگاران کو منظرِعام پرلایا ان میں انور سدید،غلام جیلانی اصغر جاوید صدیقی ممتاز مفتی ،سلمان بٹ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹرداؤد رہبر،احمد جمال پاشا،کامل القادری،رام لعل نابھوی اکبر حمیدی،مشتاق احمد،حنیف باوا، محمد اسلا م تبسم،خالد پرویز صدیقی ،انجم انصار،ارشد میر،طارق بشیر،کامل القادری ،حامد برگی،راجہ محمد ریاض الرحمٰن،شہزاد احمد،محمد اسد اللہ،محمد اقبال انجم،مشرف احمد،جان کاشمیری ،شمیم ترمذی،محمد یونس بٹ،ناصر عباس نیّر وغیرہ اہم نام ہیں۔

مشتاق قمر اور جمیل آذر اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں اردو انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں مشتاق قمر اور جمیل آذر کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انہوں نے نہ صرف خود بہت خوبصورت انشائیے لکھے بلکہ اس سلسلے میں نئی پود کی تربیت بھی کی۔ چنانچہ اگر آج چمن میں ہر طرف انشائیے کی داستان بکھری ہوئی نظر آرہی ہے اور دم بدم خوبصورت اور تازہ انشائیے لکھے جارہے ہیں تو اہلِ نظر کی طرف سے اس بات کی شاباش ان دونوں ہی کو ملنی چاہیے

مشتاق قمر کا شمار نہ صرف اردو کے اولین انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے بلکہ وہ اردو انشائیہ کے اولین نقادوں میں سے بھی ایک ہیں۔ مشتاق قمر انشائیے کی اصل روح کو پہچانتے ہیں اور زندگی کی ایک قاش کو کل سے الگ کرکے اس پر ایک ایسے نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے مشتاق قمر کے انشائیے اردو انشائیہ تحریک کا آغاز ہیں۔ اردو ادب میں وزیر آغا کے بعد دوسرے انشائیہ نگار مشتاق قمر تھے جن کے انشائیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ مشتاق قمر نے اپنے انشائیوں کی عمارت مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ کی بنیاد پر رکھی البتہ انہوں

نے اس کے میٹیریل میں اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبان وادب کا بھی اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں کے اسلوب پر اردو انشاء پردازی کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

مشتاق قمر کا تخلیقی عمل سست رو رہا جس کی وجہ ان کے مشاہدات ہیں جنہیں وہ انشائی اسلوب میں لانے کے لیے جلدی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیے تخلیقی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا ہلکا پھلکا اور لطیف انداز اپنے اندر معنوی گہرائی اور بے حد کشش رکھتا ہے۔ ان کا انشائیہ زندگی کے کسی ایسے چھوٹے سے پہلو کو جسے عام آدمی غیر اہم سمجھتا ہے ذرہ سمجھ کر پکڑتا ہے اور ستارہ بنا کر ادب کے آسمان پر ٹانک دیتا ہے۔ مشتاق قمر نے ایسی معمولی اور غیر اہم باتوں یا اشیاء کو موضوع بنایا ہے جن میں نکتہ آفرینی اور ندرتِ خیال کی گنجائش نکالنا کسی غیر انشائیہ نگار کے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔ "آئس کریم کھانا"، "بال کٹوانا"، "چھڑی"، "بیٹھنا"، "بھول جانا"، "بلاوجہ"، "ریزگاری"، "خوش فہمی" وغیرہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

جمیل آذر بنیادی طور پر انشائیہ نگار اور خالص انشائیہ نگار تھے۔ پروفیسر جمیل آذر کا شمار بھی اردو کے ان اولین انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف انشائیہ فہمی کے لیے زمین ہموار کی بلکہ بے حد خوبصورت انشائیے لکھ کر آنے والوں کے لیے ایک روشن مثال بھی قائم کردی۔ مجموعی طور پر جمیل آذر کے انشائیے اپنی بے ساختگی، شگفتگی، کھلی کھلی کیفیت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ انہوں نے اردو کو ایک موضوعاتی رخ عطا کیا جس سے انشائیہ میں معنوی اور فکری وسعت ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ موضوعاتی دائرہ بھی وسیع ہوا ہے جمیل آذر کا انشائیہ مضمون یا مقالے کی طرح منطقی یا استدلالی تحریر نہیں ہوتی بلکہ معاشرے اور ان کی اپنی زندگی کے تعلق سے ذاتی تجزیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اظہار سادہ اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس میں حکمت و فلسفہ کے ساتھ ساتھ کسی حد تک طنز و مزاح بھی ہوتی ہے لیکن وسیلے کے طور پر ہی۔ نیز ان کا طنز نشتر زنی کی بجائے مرہم کا کام کرتا ہے۔ جمیل آذر کا انشائیہ روح کو تازگی ،دل کو انبساط اور ذہن کو مسرت فراہم کرتا ہے۔ بلیغ بات کو جامع اور مختصر شکل میں پیش کرنا جس میں شگفتگی اور تازہ کاری کا عمل جاگزیں ہو ان کے انشائیوں کا کمال ہے۔ ان کے انشائیوں میں حقیقت کا اظہار، شخصی رد عمل، اختصار، عدم تکمیل، رمزیت واشاریت، غیر منطقی ربط، کفایتِ لفظی، دعوتِ فکر، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت، زبان و بیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر کر کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش ان کے انشائیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کی

یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں غمگیں دلوں کی شگفتگی کا سامان بھی ہے اور خشک خیالات کے بجائے دلکش پیرایہ اظہار بھی۔

زیرِ نظر مقالے میں لیے گئے موضوعاتی ،اسلوبیاتی اور تقابلی جائزے کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ انشائیہ نگاری میں مشتاق قمر اور جمیل آذر مشیل دی مانتین کے تصورِ انشائیہ سے متاثر بھی ہوئے اس کے انشائیوں کی پیروی بھی کی لیکن یہ بات بھی پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے مانتین سے دو قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے انشائیے کو دیسی اشیاء مثلاً پہاڑ، دریا، سمندر، میدان، دریا، دیہات، شہر، تہذیب و ثقافت، دستکاریاں اور ان سے وابستہ افکار و نظریات سے آشنائی عطا کرتے ہوئے مغربی انشائیے کو مشرق کے رنگ میں رنگنے کی کامیاب کوشش کی اور اس میدان میں اپنا مقام تسلیم کروایا۔

کتابیات

۱۔ ابوالکلام آزاد، غبارِ خاطر، ساہتیہ اکادیمی، دہلی، سوم، 1991ء

2۔ ارتضیٰ کریم، میر ناصر علی دہلوی، اردو اکادمی، دہلی، 2007ء

۳۔ اشرف، محمد خان، ڈاکٹر، تخلیقی عمل اور اس کی نوعیت وماہیت، مشمولہ ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور، مدیرہ: صدیقہ بیگم، نومبر/دسمبر ۲۰۱۰ء

4۔ افادی، مہدی، مکاتیبِ مہدی، مرتب: مہدی بیگم، اترپردیش ارسو اکادمی، لکھنو، بھارت، 1982ء

5۔ افادی، مہدی، افادات مہدی، مرتب: مہدی بیگم، سرسید بکڈپو، علی گڑھ، اول، 1958ء۔

6۔ پاشا، احمد جمال، انشائیہ کی اصطلاح، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1983ء

7۔ اسداللہ، محمد، یہ ہے انشائیہ، ناشر خود، جعفر نگر، ناگپور، انڈیا، اول، 2017ء

8۔ آدم شیخ، انشائیہ، رائٹرز امپوریم لمیٹڈ، بمبئے، اول، ۱۹۶۵ء

9۔ جمیل آذر، اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1976

10۔ جمیل آذر، شاخِ زیتون، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1981ء

۱۱۔ جمیل آذر، رت کے مہمان، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، اپریل، اول، ۱۹۹۴ء

۱۲۔ جمیل آذر، روشنی اے روشنی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۵ء

۱۳۔ جمیل آذر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، مکتبہ فکر وخیال، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء

۱۴۔ حسن نظامی، خواجہ، مضامینِ خواجہ حسن نظامی، مرتب وناشر: غلام نظام الدین، تاجر کتب، چاندنی چوک، نئی دہلی، ۱۹۱۲ء

15۔ خلیقی دہلوی، مولانا، ادبستان، کتب خانہ ناشر العلوم، لاہور،

16۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، ادارہ زبان واسلوب، علی گڑھ، اول، ۱۹۸۳ء

۱۷۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، اسلوبیاتی تنقید-نظری بنیادیں اور تجزیے، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، اول، ۲۰۱۴ء

18۔ ساحل، لطیف، اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش، الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

19۔ سدید، انور، ذکر اس پری وش کا، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اول، 1982ء،

20۔ سدید، انور،، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقیِ اردو، کراچی، 1991ء

21۔ سدید، انور، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1993ء

22۔ سندیلوی، سلام، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، فروغِ اردو، لکھنو، ۱۹۵۹

23۔ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء

24۔ سیفی، بشیر، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلشر، لاہور، ۱۹۸۹ء

25۔ صفی مرتضیٰ، سید، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1961ء

26۔ عابد علی عابد، سید، اصولِ انتقادِ ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء

27۔ عبدالستار، ڈاکٹر، میر ناصر علی-حیات وخدمات، مفیض بکڈپو، دہلی، 1999ء

28۔ عظیم آبادی، حسنین، نشاطِ خاطر، دائرہ اردو، گیا، بھارت، دوم،، ۱۹۸۰ء

29۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۹ء

30۔ قدیر زمان، سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد (انڈیا)، مارچ، 2009ء

31۔ قزلباش، سلیم آغا، منتخب انشائیے،، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، 1984ء

32۔ مشتاق قمر،بلاوجہ(انشائیہ)،مشمولہ "جدیداردو انشائیہ" ،مرتب:اکبر حمیدی،اکادمی ادبیات پاکستان،1991ء

۳۳۔ مشتاق قمر،ہم ہیں مشتاق(انشائیے)،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، جون ۱۹۷۰ء

۳۴۔ مشتاق قمر،خوش فہمی(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیر آغا،لاہور،جنوری/فروری۱۹۷۶ء

۳۵۔ مشتاق قمر،میرا کتب خانہ(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیر آغا، لاہور، مارچ/اپریل، ۱۹۷۲ء،

۳۶۔ مشتاق قمر،پھل کھانا(انشائیہ)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیر آغا،لاہور،اکتوبر۔نومبر،۱۹۷۲ء

۳۷۔ مشتاق قمر،انشائیہ نگاری(مضمون)،مشمولہ ماہنامہ اوراق،مدیر:وزیر آغا، لاہور، اکتوبر۔ نومبر،۱۹۷۵ء

۳۸۔ مدنی، ظہیر الدین،اردو ایسیز، ممکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی،اول،1985ء

۳۹۔ منشی کریم الدین،انشائے اردو نستعلیق،۔جے۔ایس۔سنت سنگھ اینڈ سنز،لاہور،۱۹۲۳ء،

۴۰۔ نابھوی،رام لعل،آم کے آم،ناشر خود،نابھا،پنجاب،بھارت،

41۔ نصیر احمد خاں،پروفیسر،آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ،اردو اکادمی،نئی دہلی،2003ء

42۔ نقوی،سجاد،پروفیسر ڈاکٹر انور سدید۔شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۱۰ء

43۔ وحید قریشی،ڈاکٹر،اردو کا بہترین انشائی ادب،میری لائبریری،لاہور،اول،۱۹۶۴ء

۴۴۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ فکر وخیال،لاہور،۱۹۹۰ء،مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،۲۰۱۲

45۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،خیال پارے(انشائیے)،مکتبہ اردو زبان،سرگودھا،1961ء

46۔ وزیر آغا،ڈاکٹر، چوری سے یاری تک(انشائیے)،موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، بھارت،1982ء

47۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،دوسرا کنارا(انشائیے)،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،جون،1982ء

48۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،سمندر اگر میرے اندر گرے(انشائیے)،مکتبہ فکر وخیال،لاہور، مئی،1989ء

49۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،معنی اور تناظر،انٹر نیشنل اردو پبلیکیشنز،دریا گنج، نئی دہلی،2005ء

50۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،تخلیقی عمل،مکتبہ اردو زبان، سرگودھا،1970ء

51۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،اردو ادب میں طنز و مزاح،اکادمی پنجاب ٹرسٹ،لاہور،مارچ،1958ء

۵۲۔ وششٹ،جاوید،انشائیہ پچیسی، سلوجہ پرکاشن، نئی دہلی،۱۹۸۵ء

53۔ ہاشمی،رفیع الدین،جامعات میں اردو تحقیق،ہائر ایجوکیشن کمیشن،اسلام آباد،۲۰۰۸ء

۵۴۔ یاد،پروفیسر مشکور حسین،ممکناتِ انشائیہ،پولیمر پبلیکیشنز،لاہور،1983ء

55۔ یلدرم،سید سجاد حیدر،خیالستان، شیخ مبارک علی ناشر کتب،لاہور، سن ندارد

56۔ یوسفی،مشتاق احمد،آبِ گم،مکتبہ دانیال، کراچی،1990ء

57۔ یوسفی،مشتاق احمد،زرگزشت،کتاب والا،دہلی،1991ء

58۔ یوسفی،مشتاق احمد،چراغ تلے، حسامی بکڈپو،حیدرآباد،بھارت۔1984ء

رسائل

1۔ اوراق،ماہنامہ، مدیر: وزیر آغا،لاہور،مارچ/اپریل،۱۹۷۲ء

۲۔ ایضاً،اکتوبر۔نومبر،۱۹۷۲ء

۳۔ ایضاً،شمارہ خاص،جولائی/اگست،۱۹۷۹ء ۴۔ایضاً، ستمبر/اکتوبر ۱۹۷۵ء

۵۔ ایضاً، اکتوبر۔نومبر، ۱۹۷۵ء

۶۔ ایضاً، جنوری/فروری ۱۹۷۶ء

۷۔ ایضاً، جنوری/فروری ۱۹۹۰ء

8۔ ادبی دنیا، ماہنامہ، مدیر: مولانا صلاح الدین احمد، شمارہ ۹،

9۔ فنون، ماہنامہ، مدیر: احمد ندیم قاسمی، لاہور، دسمبر 1967ء

10۔ ایضاً، جولائی۔اگست، 1982ء

11۔ ادبِ لطیف، ماہنامہ، لاہور، مدیرہ: صدیقہ بیگم، نومبر/دسمبر ۲۰۱۰

12۔ کتاب نما، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۳ء،

13۔ کتاب نما، ماہنامہ، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۳ء